علّامہ حمید الدین فراہیؒ

حیات و افکار

مرتب

ڈاکٹر سکندر علی اصلاحی

ترتیب

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش لفظ

پیشِ نظر کتاب 'علامہ حمید الدین فراہیؒ۔حیات وافکار' میں علاّمہ فراہی علیہ الرحمہ کا تعارف کرانے کی کوشش کی گئی ہے۔تعارف سے مقصود اصلاً علاّمہ کے افکار عالیہ اور ان کی غیر معمولی خدمات کی طرف لوگوں کو توجہ دلانا ہے۔مولانا کے افکار اور نظریات سے استفادے کی ضرورت صرف عام شائقین ہی کو نہیں ہے، بلکہ محققین علماء کو بھی ہے۔

علاّمہ فراہیؒ صرف یہی نہیں کہ قرآن مجید کی علمی وادبی عظمت اور اس کے اسرار سے آشنا تھے، بلکہ اس کے ساتھ انھیں اللہ تعالیٰ کی جانب سے حساس اور خاشع دل بھی ملا تھا، جو صوت ربانی سے لذت گیر ہونے کے لیے ضروری ہے۔

مولانا فراہیؒ نے دین کے بنیادی مآخذ سے اصول دین اخذ کیے اور انھیں دینی نظام کے ہر شعبہ پر منطبق کرنے کی سعی محمود کی۔انھوں نے دینِ حق کو ایک حکیمانہ کُل کی شکل میں پیش فرمایا۔اس لیے موصوف کو بجا طور پر علاّمہ فراہیؒ کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ان کی تصنیفات کا جائزہ لیتے ہیں تو اقسام القرآن، مفردات القرآن، دلائل النظام، اسالیب القرآن، حکمت القرآن اور حجج القرآن جیسی وقیع کتابوں سے ہم آشنا ہوتے ہیں۔فقہ القرآن اور اِحکام الاصول باحکام الرسول جیسی کتابیں تشنۂ تکمیل رہ جانے کے باوجود اس سلسلے میں علامہ جو کچھ بھی لکھ سکے ہیں وہ نہایت بیش قیمت ہے۔اس سے بہت کچھ رہ نمائی حاصل کی جاسکتی ہے۔

پیشِ نظر کتاب میں علاّمہ فراہیؒ کی علمی خدمات اوران کی زندگی کے کچھ گوشوں کونمایاں کیا گیا ہے۔ ان کے ذاتی حالات اورکوائف کے علاوہ موصوف کی کچھ امتیازی خدمات کا علمی تعارف بھی کرایا گیا ہے۔

بہرصورت اس کتاب کی حیثیت ایک بیش قیمت علمی دستاویز کی ہے۔ امید ہے اہل نظر اسے قدر کی نگاہ سے دیکھیں گے۔ اس قابل قدر خدمت کے لیے ڈاکٹر سکندر علی اصلاحی مبارک باد کے مستحق ہیں۔

دہلی — خاکسار

۲۹؍فروری ۲۰۱۷ء — محمد فاروق خاں

عرضِ مرتّب

انیسویں اور بیسویں صدی کا جب ہم جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت پورے مسلم معاشرے میں افلاس اور محرومی کا عفریت غالب تھا۔ مغلیہ سلطنت کے اختتام کے بعد لوگ حیران و پریشان تھے۔ تخت و تاج وقت کے تیز دھاروں میں تنکوں کی طرح بہہ چکے تھے، قلعوں کی برجیاں ٹوٹ چکی تھیں۔ ایسے میں چند نیک نفوس اٹھتے ہیں، حوصلہ پیدا کرتے ہیں اور اجڑے ہوئے گلشن میں از سرِ نو تعمیر نشیمن کے لیے ہمت بندھاتے ہیں۔ ایک جانب سر سیدؒ بانی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور ان کے رفقاء ہیں، دوسری جانب مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، مؤسس دارالعلوم دیوبند ہیں۔ اسی دوران خطۂ اعظم گڑھ سے ایک شخصیت ابھرتی ہے جو اپنے درد و سوز، علم و فہم اور فکر و نظر کی گہرائی اور دور اندیشی سے سب میں نیرِ اعظم ہو جاتی ہے۔ اس شخصیت کا نام ''شبلی'' ہے۔ شبلی ایک فرد کا نام نہیں شبلی تزکیۂ علم، تطہیرِ فکر و نظر، اسلامی و ملّی غیرت و حمیّت، خودداری، تلاش و کاوش، تحقیق و جستجو اور امت مسلمہ کی سربلندی کی خاطر ایک تحریک اور ایک کارواں کا نام ہے۔ شبلی نے اپنی محنت و جگر سوزی سے چاند تاروں کی ایک کہکشاں پیدا کی اور ہر ایک کو زندگی کی حرارت و تابانی سے ہم کنار کیا۔ ان جگمگاتے ستاروں میں نمایاں نام مولانا حمید الدین فراہی، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالسلام ندوی، مولانا مسعود عالم ندوی، مولانا ابوالکلام آزاد کے ہیں۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا امین احسن اصلاحی، مولانا ابواللیث اصلاحی ندوی اور مولانا صدرالدین اصلاحی جیسے لوگ بھی براہ راست یا بالواسطہ اسی زرّیں سلسلے کی قیمتی کڑیاں ہیں جنھوں نے کلمۂ طیبہ کی سربلندی اور کلمۂ خبیثہ کی بیخ کنی کے لیے اپنی زندگیاں نثار کر دیں۔ ہندوستان میں اعلائے کلمۃ اللہ کی تحریک ہو یا حکومت الٰہیہ کے قیام کی تگ و دو، غلبۂ اسلام کی جد و جہد ہو یا اقامت دین کی سعی و کاوش علامہ شبلی اور مولانا حمید الدین فراہی کو کبھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ تحریک اسلامی کے لیے تنظیم و تعمیر میں سرِ بام اگر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی،

مولانا امین احسن اصلاحی اور مولانا مسعود عالم ندوی جیسے علماء و رہ نما نظر آتے ہیں تو اُن کی بنیاد میں علامہ شبلی اور مولانا فراہی کے افکار 'خشت اول' کی شکل میں موجود پائے جاتے ہیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ علامہ شبلیؒ نے جو نصب العین متعین کیا، اس نصب العین کے حصول کے لیے جس طرح کے رجالِ کار مطلوب تھے، اُن کی تیاری کا خاکہ علامہ فراہیؒ نے بنایا، بلکہ اس نصب العین کے پیشِ نظر بہ طور ماڈل اپنے شاگردانِ عزیز مولانا اختر احسن اصلاحیؒ اور مولانا امین احسن اصلاحیؒ کو تیار کیا۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ بھی کسی نہ کسی طرح بالواسطہ یا براہِ راست مولانا فراہیؒ کے شاگرد ہیں۔ مولانا مودودیؒ کی علمی وفکری تعمیر وتشکیل میں علامہ شبلیؒ، مولانا فراہیؒ علامہ اقبالؒ اور مولانا ابوالکلام آزاد کی تحریروں کا نمایاں کردار شامل ہے۔

ان حضرات نے بیسویں صدی میں قرآن وسنت کی بنیاد پر اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے کس طرح روشن تاریخ رقم کی ہے وہ اظہر من الشّمس ہے۔ یہ تمام ہستیاں بہ ظاہر بکھری ہوئی اور جدا نظر آتی ہیں، مگر حقیقت میں یہ مربوط ہستیاں ہیں اور کیوں نہ ہوں کہ ان تمام گرامی قدر ہستیوں کے درمیان نقطۂ ربط واتحاد قرآن مجید اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ ان کے سانچے میں ڈھل کر جو فرد تیار ہوگا، اس کی زندگی کا جو مطمحِ نظر ہوگا اور اس کی جو منزلِ مقصود ہوگی وہ وہی ہوگی، جس کا ذکر مذکورہ سطروں سے عیاں ہے۔ دنیا میں جہاں کہیں سچائی چمکتی ہے، جہاں کہیں محبت وانسانیت دکھائی دیتی ہے، جہاں کہیں عدل وانصاف کا کوئی اصول برگ وبار لاتا ہے، وہ سب اسی 'بزم شبلی وفراہی' کی طرح قرآن وسنت میں غور وفکر اور تدبر کا عطیہ ہے۔ یعنی وہ حمایتِ حق میں حرکت اور اقدام میں سبقت کرنے والا، باطل نظریات اور طاغوتی طاقتوں کے خلاف برسرِ پیکار اور دین قیم کے قائد وانقلاب کا رہ نما ہوگا۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اُن تمام مضمون نگار حضرات کو جزائے خیر دے جنھوں نے مولانا فراہی کی زندگی اور فکر کے کسی نہ کسی گوشے کو اجاگر کیا ہے۔ انشاء اللہ اُن کے اخلاصِ نیت کا اجر انھیں ضرور ملے گا۔ استاد محترم مولانا نسیم ظہیر اصلاحی کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے اس مجموعے کو مرتب کرنے کے دوران میں قدم قدم پر میری رہ نمائی کی۔

خاکسار

سکندر علی اصلاحی

سرائے میر

علامہ سید سلیمان ندویؒ

مولانا حمید الدین فراہیؒ

فغاں کہ گشت نیو شندۂ سخن خاموش
وگر چگو نہ تسلی کنم ایں لب و گوش

(حمید)

اس سے پہلے ہندوستان کے جن اکابر علماء کا ماتم کیا گیا ہے وہ کل وہ تھے، جن کی ولادت اورنشوونما انقلاب زمانہ سے پہلے ہوئی تھی۔ آج سب سے پہلی دفعہ ہم نئے عہد کے سب سے پہلے عالم کی وفات کے ماتم میں مصروف ہیں۔ ہم ایک ایسے گریجویٹ عالم کا ماتم کر رہے ہیں جو اپنے علم وفضل، زہد وورع اور اخلاق وفضائل میں قدیم تہذیب کا نمونہ تھا، لیکن جو اپنی روشن خیالی، جدید علوم وفنون کی اطلاع وواقفیت اور مقتضیات زمانہ کے علم وفہم میں عہد حاضر کی سب سے بہتر مثال تھا۔ اس سے پہلے ان تمام علماء نے جو نئے علم کلام کا اپنے کو بانی کہتے اور سمجھتے ہیں، جو کچھ کہا اور لکھا، وہ دوسروں سے سنی سنائی باتیں تھیں، لیکن اس جماعت میں یہ پہلی ہستی تھی جس نے فلسفۂ حال کے متعلق نفیاً یا اثباتاً جو کچھ کہا اور لکھا وہ اپنی ذاتی تحقیق اور ذاتی علم ومطالعہ سے کہا اور لکھا۔

آج ہمارے سامنے ایسے متعدد علماء کی مثالیں ہیں جنہوں نے عربی علوم کے بعد انگریزی تعلیم شروع کی اور بی۔اے اور ایم۔اے اور پی۔ایچ۔ڈی کی سندیں حاصل کیں، لیکن اس طرح کہ

جو پڑھا لکھا تھا نیاز نے اسے صاف دل سے بھلا دیا

نئے رنگ نے پرانے رنگ کو اتنا پھیکا کر دیا کہ ان پر اس کا نشان بھی نظر نہیں آتا، لیکن آج ہم جس ہستی کا تذکرہ کر رہے ہیں، اس کا یہ حال تھا کہ اس کے نئے رنگ کی شوخی سے اس کے پرانے رنگ کا گہرا پن اور بڑھ گیا تھا اور اس کو دیکھ کر یہ سمجھنا بھی مشکل تھا کہ یہ علی گڑھ کالج اور الٰہ آباد یونیورسٹی کا گریجویٹ ہے، بلکہ سچ یہ ہے کہ اس کی سادگی کو دیکھ کر عوام بظاہر اس کو عالم بھی بہ مشکل ہی باور کر سکتے تھے، مگر وہ تھی جو ابنائے زمانہ میں کوئی نہیں۔

ولادت

اعظم گڑھ سے دو اسٹیشن پہلے 'فریہا' ایک گاؤں ہے، وہی مولانا کا پدری وطن تھا۔ اسی 'فریہا' کو عربی شکل دے کر مولانا اپنے نام کے ساتھ کبھی کبھی فراہی لکھا کرتے تھے، مولانا شبلی مرحوم اور مولانا حمید الدین میرے، پھوپھیرے بھائی تھے۔ مولانا حمید الدین کے والد مولوی عبدالکریم صاحب مولانا شبلی کے ماموں تھے۔ ان دونوں بھائیوں کی پیدائش چھ برس آگے پیچھے ہوئی۔ مولانا شبلی ۱۸۵۷ء میں پیدا ہوئے۔ اور حمید الدین صاحب ۱۸۶۲ء/ ۱۲۸۰ھ میں۔ مولانا حمید الدین کے حقیقی چھوٹے بھائی شیخ حاجی رشید الدین صاحب ہیں، جو علی گڑھ کالج کے پرانے تعلیم یافتوں میں ہیں اور سرسید کے عہد کے طالب العلم ان سے اچھی طرح واقف ہیں۔

مولانا کا اصلی نام تو حمید الدین تھا، مگر وہ اس نام کو جو درحقیقت عربی قاعدہ سے لقب ہے۔ اپنے لیے معنوی حیثیت سے بلند سمجھتے تھے، اس لیے وہ عربی تصانیف میں اپنا نام عبدالحمید لکھتے تھے اور تمام بڑے بڑے عالمانہ آداب و القاب کو چھوڑ کر صرف معلم کہلانا اپنے کو پسند فرماتے تھے۔ بنابریں وہ اپنا نام المعلم عبدالحمید الفراہی کتابوں کی لوحوں پر لکھا کرتے تھے۔

تعلیم

مولانا نے پہلے حفظ شروع کیا اور قرآن مجید کے حافظ ہوئے۔ فارسی کی ابتدائی کتابیں اسی ضلع کے ایک دیہات 'چتارا' کے باشندہ مولوی مہدی حسین صاحب سے پڑھی۔ اس زمانہ میں

شرفاء کی تعلیم کا فارسی ادب سب سے اہم جز تھا، مولانا کو ادبیات سے فطری لگاؤ تھا۔ چنانچہ فارسی زبان اور فارسی ادب کا ذوق بچپن سے ان میں نمایاں تھا، اس وقت مولانا شبلی مرحوم عربی کی اعلیٰ کتابیں اعظم گڑھ میں مولانا فاروق صاحب چریا کوٹی سے پڑھ رہے تھے، مولانا فاروق صاحب اپنے عہد کے سب سے بڑے عالم ہونے کے ساتھ فارسی کے بھی بہت بڑے ادیب اور استاد تھے، مولانا حمید الدین صاحب کی آمد و رفت یہاں بھی رہا کرتی تھی اور یہ عالمانہ صحبتیں ان کو ملا کرتی تھیں۔

ابھی مولانا کی عمر سولہ برس کی تھی کی فارسی کے سب سے مشکل گو شاعر خاقانی شروانی کے تتبع میں ایک قصیدہ لکھا جس کی ردیف آئینہ اور قافیہ جوہر، کیفر وغیرہ ہے، سلطان عبدالحمید خاں کی مدح میں ہے، مطلع ہے :

بے جلوہ رخِ تو بود مضطر آئینہ — خار افگند بہ پیرہن از جوہر آئینہ

بعد کے شعر ہیں :

گیسوئے ہمچو شب تو بیارا ے وہم بصبح — فرمائے تو بیا وردا ز خاور آئینہ
گستاخ دیدہ است بردے تو لا جرم — چشم سپید یافت بدیں کیفر آئینہ
آئینہ واگذارو بیاورد ودیدہ ام — چشم بو ذر آئینہ بہتر ہر آئینہ
در بزم انس خویش چرا جائے دادہٗ — تامی شو د برابر تو اکثر آئینہ

کے با ضمیر شاہ شود وہمسر آفتاب
کے روئے ہمچو ماہ تر ہمسر آئینہ

۲۸ شعروں کا قصیدہ تھا، لوگوں کو پڑھ کر بڑی حیرت ہوئی۔ یہ فارسی، یہ لطف زبان، یہ شیرینی اور یہ شکوہ، دیکھ کر سب کو تعجب تھا۔ مولانا شبلی فرماتے تھے: میں نے اس کو لے جا کر مولانا فاروق صاحب کو دکھایا اور پوچھا کہ آپ کے نزدیک یہ کس کا کلام ہے۔ انہوں نے فرمایا: یہ تو نہیں بتا سکتا۔ مگر قدماء میں سے کسی کا معلوم ہوتا ہے۔ مولانا شبلی نے فرمایا یہ حمید کا ہے۔ حیرت ہوگئی۔

مولانا حمید الدین صاحب فطرۃً نہایت ہی ذہین، نہایت طبّاع اور نہایت دقیقہ رس تھے۔ ان کا ذہن نہایت ہی صاف تھا۔ وہ اول وہلہ ہی میں بے کج و پیچ حقیقت کی منزل مقصود تک پہنچ جاتے تھے، ان کا تیرِ نظر مسائل کی تشریح اور مشکلات کے حل میں ہمیشہ نشانہ پر بیٹھتا تھا،

دماغ اتنا سلجھا تھا کہ کتنا ہی پیچیدہ مسئلہ ہو وہ اس کی اصل تہ تک پہنچ جاتے تھے، اور اگر وہ مناظرہ پر اتر آتے تو کیسی ہی غلط بات ہو وہ اس کی ایسی عمدہ عمدہ دلیلیں پیش کرتے تھے کہ حریف ساکت ہو جاتا تھا، اور سمجھ لیتا تھا کہ یہ مولانا کی اصل رائے ہے، مگر تھوڑی دیر کے بعد وہ مسکرا کر فرماتے کہ یہ تو غلط تھا، اصلیت یہ ہے۔

فارسی کے بعد مولانا نے عربی تعلیم شروع کی اور بھائی (مولانا شبلی) سے عربی پڑھنے لگے، چنانچہ متوسطات تک مولانا شبلی ہی سے تعلیم پائی، مولانا جب یہاں سے باہر نکلے تو یہ بھی گئے۔ لکھنؤ جا کر مولانا حمید الدین صاحب نے فرنگی محل میں مولانا عبدالحی صاحب فرنگی محلی سے کچھ پڑھا۔ اس زمانہ میں لکھنؤ میں خواجہ عزیز الدین صاحب عزیز لکھنوی (پروفیسر فارسی کیننگ کالج لکھنؤ و مصنف قیصر نامہ) لکھنؤ میں فارسی کے نہایت مستند استاد اور شاعر تھے، ان کی صحبتوں میں شرکت کا اتفاق ہوتا رہا، اور ان دونوں بھائیوں سے خواجہ صاحب کے اس فارسی کے رشتہ سے تعلقات محبت عزیزانہ حیثیت تک پہنچ گئے تھے۔ لکھنؤ کے بعد مولانا لاہور جا کر مولانا فیض الحسن صاحب سہارنپوری سے عربی ادب کی کتابیں پڑھیں، اس زمانہ میں یہاں نیا نیا اورینٹس کالج کھلا تھا، مولانا فیض الحسن صاحب اپنے عہد کے مشہور ادیب اس میں مدرس تھے، ان کا نام سن کر دور دور سے طلبہ پڑھنے آتے تھے، لیکن مولانا حمید الدین صاحب نے مولانا فیض الحسن صاحب سے خارج میں پڑھا، اور یہیں ان کی ملاقات مولوی وحید الدین صاحب سلیم پانی پتی سے ہوئی، اور وہ دوستی تک پہنچی، جو آخر دم تک قائم رہی، اور اسی دوستی کی کشش تھی کہ مولوی وحید الدین صاحب سلیم جامعہ عثمانیہ حیدر آباد تک پہنچے۔

مولانا بیس برس کی عمر میں (۱۳۰۰ھ) ۱۸۸۴ء میں عربی تعلیم سے فارغ ہو گئے اور عربی ادب میں بھی وہ کمال حاصل کیا کہ سچ یہ ہے کہ وہ اس میں اپنے استادوں سے بھی گویا سبقت لے گئے، ان کا عربی دیوان اس بیان کا شاہد ہے۔

انگریزی تعلیم

اس زمانہ میں انگریزی پڑھنا کفر سمجھا جاتا تھا، مگر یہ کفر مولانا نے توڑا۔ نجی کے طور پر

انگریزی کچھ پڑھ لینے کے بعد کرنل گنج اسکول الٰہ آباد میں داخل ہو گئے، انٹرنس کا امتحان پرائیویٹ طور پر دے کر ایم۔اے، او کالج علی گڑھ میں داخل ہوئے، یہ علی گڑھ کالج کے اوجِ شباب کا زمانہ تھا، سرسید اس کے ناظم اعلیٰ، مسٹر آرنلڈ وغیرہ اس کے پرنسپل اور پروفیسر، اور مولانا شبلی اس کے مدرس، مولانا حالی وہاں کے مقیم وساکن تھے، ہر وقت علمی مسائل وتحقیقات کے چرچے رہتے تھے، اور ان بزرگوں کی صحبتیں حاصل تھیں، جن میں ہر ہونہار طالب العلم کے فطری جوہر کے چمکنے کا موقع حاصل تھا۔ مسٹر آرنلڈ فلسفہ پڑھاتے تھے، مولانا کو فلسفہ جدیدہ کا ذوق انہیں کی تعلیم سے ہوا۔

اس زمانہ میں کالج کے ہر طالب العلم کو عربی وفارسی بھی لازماً پڑھنا پڑتی تھی، مگر سرسید نے ان کے متعلق مسٹر بک کو لکھ کر بھیجا، حمید الدین عربی وفارسی کے ایسے ہی فاضل ہیں جیسے آپ کے کالج کے استاد اور پروفیسر ہیں، اس لیے ان کو مشرقی علوم کے گھنٹوں سے مستثنیٰ کر دیا جائے، چنانچہ وہ مستثنیٰ کیے گئے۔

مولانا حمید الدین صاحب کی تالیف وتصنیف کا عہد طالب العلمی ہی سے شروع ہو گیا تھا۔ اور خود بزرگوں نے فرمائش کر کے شروع کرایا، اسی زمانہ میں علی گڑھ کالج کے دینیات کے لیے سرسید نے مولانا شبلی مرحوم سے عربی میں سیرتِ نبویؐ پر ایک مختصر رسالہ لکھوایا تھا، جس کا نام ''تاریخ بدء الاسلام'' ہے، پھر مولانا حمید الدین صاحب سے اس کا فارسی میں ترجمہ کرایا، استاد و شاگرد کے یہ دونوں عربی وفارسی رسالے اسی وقت چھپ گئے تھے۔

سرسید کو طبقات ابن سعد کا ایک ٹکڑا وفود نبوی کے متعلق کہیں سے ہاتھ آیا تھا، اس وقت تک یہ چھپی نہیں تھی، سرسید نے مولانا حمید الدین صاحب سے اس کا فارسی ترجمہ کرا کے چھپوایا، اس کی زبان ایسی ہے معلوم ہوتا ہے کہ عہد سامانی کا کوئی نثر نویس فارسی لکھ رہا ہے۔

غالباً ۱۸۹۴ء میں یا اس کے پس وپیش الٰہ آباد یونیورسٹی سے بی۔اے کی سند حاصل کی، ۱۸۹۵ء میں عربی میں ایم۔اے کا امتحان دینا چاہا، مگر نہیں دے سکے۔ ۱۸۹۶ء میں مدرسۃ الاسلام، کراچی میں مدرسی کی کوشش کی، سرسید نے سرٹیفکیٹ دیا، اسی زمانہ میں مسٹر آرنلڈ انگریزی عربی گرامر کی ایک مختصر کتاب ترجمہ کرانا چاہتے تھے، اس کے لیے مولانا ہی کا نام ان کے ذہن میں تھا۔

ملازمت

بہرحال مولانا کا تعلیمی عہد ختم ہوگیا۔ ۱۸۹۷ء میں وہ مدرستہ الاسلام، کراچی میں مدرس مقرر ہو گئے۔ یہ مسلمانوں کا انگریزی کا بہت پرانا اسکول ہے، اس کی عمارت بہت شان دار اور اسٹاف بہت اعلیٰ ہے، اور سندھ میں اس کو کافی شہرت حاصل ہے، مولانا اس میں ۱۹۰۶ء تک رہے۔ ۱۹۰۰ء میں امیر عبدالرحمن خاں والی کابل ایک ترجمہ کا محکمہ قائم کرنا چاہتے تھے، اس میں ابن خلدون کا ترجمہ بھی پیشِ نظر تھا، اس کے لیے مولانا شبلی نے ان کا انتخاب کیا، مگر کسی وجہ سے یہ تجویز عمل میں نہ آسکی اور وہ کراچی میں بدستور رہے، اور درس و تدریس کے علاوہ تصنیف و تالیف کا شغل جاری رکھا، یہیں قیام کے زمانہ میں ۱۹۰۳ء میں ان کا فارسی دیوان شائع ہوا، اور مولانا شبلی مرحوم کے بار بار کے تقاضے سے جیسا کہ مکاتیب شبلی جلد دوم میں ان کے خطوط سے ظاہر ہے، علمی مباحث پر نقد و نظر کی طرف توجہ فرمائی، اور خصوصیت کے ساتھ قرآن پاک کے نظم و بلاغت میں انہماک پیدا ہوا، اور جمہرۃ البلاغۃ نام کا رسالہ لکھا، جس کا خلاصہ مولانا شبلی مرحوم نے خود اپنے قلم سے الندوہ، دسمبر ۱۹۰۵ء میں شائع کیا۔

اسی زمانہ میں (غالباً ۱۹۰۴ء میں) جب اس وقت کے وائس رائے لارڈ کرزن نے سواحل عرب اور خلیج فارس کا سیاسی بحری سفر کیا تھا، اور سواحل کے عرب شیوخ اور امراء کو اپنی ملاقات کے لیے جمع کیا تھا، تو مولانا ہی کا انتخاب ترجمان کی حیثیت سے ہوا تھا، وہ اس سفر میں لارڈ کرزن کے ساتھ تھے، اور عرب سرداروں کے سامنے لارڈ کرزن کی طرف سے جو عربی تقریر پڑھی گئی تھی، وہ انہیں کی لکھی ہوئی تھی۔

۱۹۰۶ء میں گورنمنٹ نے علی گڑھ کالج کو ایک معتدبہ عطیہ عربی تعلیم کے لیے دیا تھا، جس کے لیے شرط یہ تھی کہ اس کا پروفیسر کوئی یوروپین ہو، چنانچہ جرمن فاضل یوسف ہارویز کا ا ل کے لیے انتخاب ہوا، ساتھ ہی مولانا کا انتخاب مددگار پروفیسر کی حیثیت سے ہوا، اور وہ علی گڑ چلے آئے، علی گڑھ میں بھی وہ زیادہ دن نہیں رہے، بہرحال جتنے دن بھی رہے، ا ے علمی کاروبا میں مصروف رہے۔ ہارویز صاحب مولانا سے اپنی عربی کی تکمـ رتے تھے اد انا ان سے

عبرانی سیکھتے تھے، اور ساتھ ہی قرآن پاک کی تفسیر اور تفسیر کے مقدمہ کے اجزا کی تالیف کا کام جاری تھا۔

مولانا شبلی مرحوم کے تعلق کے سبب سے، پھر خود مولانا حمید الدین صاحب کے ذاتی فضل وکمال کے باعث علی گڑھ کے علمی حلقوں سے ان کے روابط قائم ہو گئے تھے، خصوصاً نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی رئیس حبیب گنج کی ذوق آشنا اور قدر شناس نگاہوں سے وہ کہاں بچ سکتے تھے، چنانچہ اکثر آمد ورفت رہتی تھی، نواب صاحب ممدوح تھے مولانا کی وفات کے بعد جو والا نامہ مجھے لکھا ہے، اس میں رقم فرماتے ہیں :

> ''مجھ کو مولانا سے دیرینہ نیاز حاصل تھا، ابتدائی ملاقات کا ذریعہ علامہ شبلی مرحوم تھے، علی گڑھ کی پروفیسری کے زمانہ میں ملا، پھر حیدرآباد میں .... علی گڑھ کے دور میں بھی تدبر قرآن کا شغف جاری تھا، روزانہ ۳ بجے شب سے صبح کے نو بجے تک اس میں وقت صرف کرتے تھے، ملاقات کے وقت نتائج تحقیق بیان فرماتے۔ اس زمانہ میں دیگر کتب سماوی کا مطالعہ اور اس کی مدد سے مطالب قرآنیہ کا حل خاص کر پیش نظر تھا، اسی حالت میں علی گڑھ چھوڑا۔''

اجزا جو لکھتے جاتے تھے، وہ مولانا شبلی مرحوم کی خدمت میں بھیجتے رہتے تھے، اور مولانا اس کے متعلق اپنی رائے خطوط میں اور زبانی ظاہر فرماتے تھے، شروع میں استاد کو اپنے شاگرد کے اس نظریہ سے اختلاف تھا کہ قرآن پاک کے مطالب ومعانی مرتب ومنظم ہیں، اور وہ مولانا حمید الدین صاحب کی اس کوشش کو رائگاں سمجھتے تھے، لیکن جب انہوں نے ان کی تفسیر کے متعدد اجزا دیکھے تو قائل ہوتے چلے گئے، اور آخر داد دینے لگے، اور حوصلہ افزائی کرنے لگے، اور آخر میں تو وہ مولانا حمید الدین کی نکتہ دانی کے اس درجہ قائل ہو گئے تھے کہ قرآنی مشکلات کے حل میں وہ ان سے مشورہ لینے لگے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں :

> ''تفسیر ابی لہب اور جمہرۃ البلاغۃ کے اجزاء بغور دیکھے، تفسیر پر تم کو مبارکباد دیتا ہوں، تمام مسلمانوں کو تمہارا ممنون ہونا چاہیے، بلاغت کے بعض اجزاء معمولی اور سرسری ہیں، ارسطو کا ردّ البتہ قابل قدر ہے۔'' (جون ۱۹۰۵ء)

علی گڑھ کے قیام ہی کے زمانہ میں انہوں نے اقسام القرآن لکھی، یعنی اس مشکل کا حل فرمایا کہ خدا نے قرآن مجید میں قسمیں کیوں کھائی ہیں۔ اس سوال کے جواب میں سب سے پہلے امام رازی نے تفسیر کبیر میں جستہ جستہ فقرے لکھے تھے، پھر ابن القیم نے التبیان فی اقسام القرآن لکھی، مگر مولانا حمید الدین صاحب کی تحقیقات نے اپنی الگ شاہ راہ نکالی، اور حقیقت یہ ہے کہ اس بارے میں انہوں نے ایسی داد تحقیق دی کہ تیرہ سو برس میں اسلام میں کسی نے نہیں دی۔ مولانا شبلی مرحوم نے ان کے اس رسالہ کا خلاصہ نہایت مسرت اور خوشی کے ساتھ الندوہ اپریل ۱۹۰۶ء میں شائع کیا، اور عربی رسالہ اقسام القرآن کے نام سے الگ شائع ہوا، اس کے بعد اس رسالہ کو مزید تحقیقات سے مؤید کر کے امعان فی اقسام القرآن کے نام سے علی گڑھ میں چھپوایا، اس وقت سے لے کر آج تک مختلف مدعیان تحقیق نے اقسام القرآن پر جو کچھ کہا ہے، وہ تمام تر مولانا کے خوان علم کی زلّہ ربائی ہے۔

اس کے بعد اگست ۱۹۰۶ء میں اقسام القرآن کے علاوہ سورۂ ابی لہب اور سورۂ قیامہ کی تفسیریں چھپیں، اور اہل علم نے ان کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا، علّامہ سید رشید رضا صاحب المنار مصر جو خود تفسیر لکھ رہے تھے، انہوں نے ان پر مدّاحانہ اور معترفانہ تقریظ لکھی اور تحسین کی۔

۱۹۰۴ء کے بعد جب مولانا حمید الدین صاحب کراچی یا علی گڑھ سے وطن آتے جاتے تو لکھنؤ میں بھائی کے پاس کچھ دن ٹھہر کر آتے جاتے، اور ۱۹۰۵ء سے مولانا خاص طور سے تقاضا کر کے بلواتے اور اپنے پاس ٹھہراتے، مقصود یہ تھا کہ ندوہ کے طلبہ ان سے فائدہ اٹھائیں، چنانچہ انہیں کے اصرار سے کئی دفعہ وہ ندوہ میں آ آ کر رہے، اور طلبہ کو کبھی فلسفہ جدیدہ اور کبھی قرآن کے سبق پڑھائے، میں بھی اس زمانہ میں ندوہ کا طالب العلم تھا، مولانا کے ان درسوں سے مستفید ہوا۔

اس زمانہ میں مولانا ابوالکلام صاحب مولانا شبلی مرحوم کے پاس ندوہ میں مقیم تھے، اور الندوہ کے مددگار اڈیٹر تھے، وہ مولانا حمید الدین صاحب کی ان صحبتوں سے مستفید ہوتے رہے، اور قرآن پاک کے درس و نظر کے نئے راستوں کے نشان پانے لگے، اور بالآخر الہلال کے صفحات میں اس جادہ پیمائی کے مختلف مناظر، سب کی نظروں کے سامنے آئے، اسی زمانہ میں ندوۃ العلماء نے ان کو اپنی مجلس انتظامی کا رکن بنایا اور آخر زمانہ تک وہ برابر رکن رہے۔

مولانا حمید الدین صاحب علی گڑھ میں دو سال کے قریب رہے، اس کے بعد ۱۹۰۸ء میں الٰہ آباد یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ کالج کے درس کے علاوہ بقیہ اوقات وہ تالیف و تصنیف میں صرف کرتے تھے، یہیں سے انہوں نے سورۂ تحریم کی تفسیر شائع کی، اور خالص فارسی میں یعنی عربی الفاظ کی آمیزش کے بغیر، حضرت سلیمان علیہ السلام کے مواعظ کا عبرانی سے فارسی نظم (مثنوی) میں ترجمہ شروع کیا تھا، مولانا کا الٰہ آباد ہی میں قیام تھا کہ ان کے اہل برداری میں ایک نئے عربی مدرسہ کے قیام کی تحریک پیدا ہوئی، مولانا شبلی اور مولانا حمید الدین صاحب مرحوم نے اس تحریک کی عنان اپنے ہاتھ میں لی، اور ۱۹۱۰ء میں اعظم گڑھ میں مولانا حمید الدین صاحب کے قریہ فریہا سے ایک اسٹیشن بعد سرائے میر نامی مقام میں آبادی سے باہر ایک باغ میں اس مدرسہ کی بنیاد رکھی گئی، مولانا شبلی نے اس کی نظامت کا بار مولانا حمید الدین صاحب کے کندھے پر رکھنا چاہا، ۱۹/اپریل ۱۹۱۰ء کے ایک مکتوب میں وہ لکھتے ہیں:

''کیا تم چند روز سرائے میر کے مدرسہ میں قیام کر سکتے ہو، میں بھی شاید آؤں اور اس کا نظم و نسق درست کر دیا جائے، اس کو گروکل کے طور پر خالص مذہبی مدرسہ بنانا چاہیے، یعنی سادہ زندگی اور قناعت اور مذہبی خدمت مطمح زندگی ہو۔''

اس مدرسہ نے رفتہ رفتہ ان دونوں بزرگوں کے زیر ہدایت ترقی شروع کی، اور یہ لوگ کبھی کبھی اس کو دیکھتے رہے، مولانا ۱۹۱۳ء تک الٰہ آباد میں رہے، حیدرآباد دکن میں دارالعلوم کے نام سے ایک قدیم عربی مدرسہ تھا، جس نے حیدرآباد کی علمی و تعلیمی ترقی میں کارنمایاں انجام دیا تھا، اس کا الحاق مدراس یونیورسٹی کے شعبۂ مشرقیات سے تھا، غالباً ۱۹۰۸ء میں مدراس یونیورسٹی نے اس الحاق کو توڑ دیا، اب ریاست کے تعلیمی محکمہ کے ذمہ دار افسروں کو اس قدیم مدرسہ کے جدید انتظامات و تغیرات کی فکر لاحق ہوئی، اور اس کے لیے نواب عماد الملک مرحوم سابق ناظم تعلیمات حیدرآباد دکن، اور مسٹر الما لطیفی آئی۔ سی۔ ایس جو اس وقت ناظم تعلیمات تھے، اور مسٹر حیدری وغیرہ نے اہل فن کی مجلس بنائی، جس کے ایک ممبر مولانا شبلی مرحوم تھے، مولانا نے اس کے لیے ایک اسکیم مرتب کی، اور ایک مشرقی یونیورسٹی کی بنیاد رکھنے کی تجویز پیش کی، یہ تجویز اسی وقت الندوہ میں مولانا نے شائع بھی کر دی تھی، مولانا شبلی مرحوم کا اس وقت کا تخیل یہ تھا کہ عربی زبان کی

ایک یونیورسٹی ہوگی، جس میں جدید علوم کی بقدر ضرورت آمیزش ہوگی، یہ اسکیم مدت تک زیر بحث رہی، اس اسکیم کے مطابق دارالعلوم کو چلانے کے لیے مولانا حمید الدین صاحب کا انتخاب ہوا، اور وہ اس کے صدر (پرنسپل) بنائے گئے۔ اور ۱۹۱۴ء کے اوائل میں الہ آباد سے حیدر آباد چلے گئے۔

حیدر آباد جاکر اس نئی مشرقی یونیورسٹی کا خاکہ بنانے میں مصروف ہوئے، درس وتدریس کے علاوہ مدرسہ کی انتظامی نگرانی بھی ان کو کرنی پڑی تھی، انہوں نے رفتہ رفتہ مدرسہ کی ظاہری و باطنی ترقیوں کی کوششیں شروع کیں، مسٹر الما لطیفی سے ان کے خیالات کا اتحاد نہ ہوا، بالآخر ایک دوسال کے بعد مسٹر الما لطیفی کی جگہ راس مسعود صاحب نے لے لی، اور انہوں نے ان کے ساتھ مل کر کام شروع کیا۔

مولانا شبلی مرحوم کی فرمائش سے نواب عماد الملک مرحوم نے قرآن پاک کے انگریزی ترجمہ کا جو کام شروع کیا تھا۔ وہ نصف کے قریب انجام پاچکا تھا، مگر اس میں جا بجا نقائص تھے، نواب صاحب نے مولانا حمید الدین صاحب کی موجودگی سے فائدہ اٹھایا، اور مدت تک یہ شغل جاری رہا کہ مولانا روزانہ صبح کو نواب صاحب کے یہاں جاتے، اور نواب صاحب باایں ہمہ ضعف وپیری انگریزی ترجمہ پر مل کر غور کرتے، اور مناسب مشورہ ملنے پر اصلاح وترمیم کرتے، اس طرح ان کے ترجمہ کے کئی پاروں پر نظر ثانی ہوئی، پھر یہ کام رک گیا، لیکن یہ کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ نواب صاحب مرحوم کی وفات کے بعد یہ اصلاح شدہ اجزاء اس طرح کاغذات میں مل گئے کہ پھر ان کا پتہ نہ چلا۔ میں نے نواب صاحب مرحوم کے خلف الرشید نواب مہدی یار جنگ بہادر کو تحریری وزبانی کئی دفعہ ان کی تلاش کی طرف توجہ دلائی مگر انہوں نے ان کے ملنے سے مایوسی ظاہر کی۔

مولانا شبلی مرحوم اس وقت سیرۃ النبیؐ کی پہلی جلد لکھ رہے تھے۔ یہود ونصاریٰ اور اہل کتاب کے مناظرانہ مسائل اور قرآن پاک کے استدلالات میں وہ برابر اپنے بھائی سے مشورہ لیتے رہتے تھے، جو مکاتیب (۵۷۔ ۷۳) سے ظاہر ہیں۔ سیرت النبیؐ جلد اول کے مقدمہ میں حضرت اسماعیلؑ کی سکونت اور قربانی کے متعلق جو باب ہیں، اس کا مواد مولانا حمید الدین ہی نے بہم پہنچایا تھا، جس کو آئندہ چل کر مولانا حمید الدین صاحب مرحوم نے بڑھا کر اور پھر اور زیادہ

استقصاء کر کے الرائی الصحیح فی من ھو الذبیح کے نام سے الگ شائع کر دیا۔

مولانا حمید الدین صاحب فطرتاً نہایت تنہائی پسند، گوشہ نشین، اور بڑے لوگوں کے ملنے جلنے سے وہ عمداً بچتے تھے، اس لیے حیدرآباد دکن جا کر بھی جو ایک عالم کا مرکز، اور خوش قسمتیوں کا عجائب خانہ ہے، ان کی حالت میں کوئی تغیر نہیں ہوا، سوا اپنے حلقے کے خاص لوگوں کے جن سے ان کو اتحاد ذوق تھا، اور کہیں آتے جاتے نہیں تھے۔

اب یہ وہ زمانہ ہے، جب مولانا شبلی مرحوم، اور ندوۃ العلماء کے دوسرے اراکین کے درمیان کشیدگی پیدا ہوگئی تھی، جس کا سبب سوائے اس کے کچھ نہ تھا کہ یہ کنزروٹیو اور لبرل کی پرانی جنگ تھی۔ اواخر ۱۹۱۳ء میں مولانا شبلی نے دار العلوم ندوۃ العلماء کی معتمدی سے استعفا دیا، تو اپنی پرانی تجویز یعنی ایک دار المصنفین اور دار التکمیل کی بنیاد ڈالنے کا خیال آیا، مگر یہ خیال ہنوز دل میں تھا یا کاغذ کے صفحہ پر تھا، اس کے لیے کبھی لکھنؤ، کبھی کسی اور مقام کی فکر تھی، اسی اثنا میں اگست ۱۹۱۴ء میں مولانا شبلی کے عزیز بھائی مولوی اسحاق صاحب وکیل ہائی کورٹ الٰہ آباد کے انتقال نے ان کو بالکل سرد کر دیا اور لوٹ کر اعظم گڑھ کو اپنا ٹھکانا بنایا، اس کے لیے زمین و بنگلہ وقف کیا اور چاہا کہ مدرسہ سرائے میر اور اپنے نیشنل ہائی اسکول (جس کو ۱۸۸۴ء میں یہیں قائم کیا تھا) اور دار المصنفین کو ملا کر ایک علمی و تعلیمی دائرہ بنالیں، اس عزم و یاس کے عالم کشمکش میں مولانا حمید الدین صاحب کو لکھا:

> "بھائی! اچھا ہونا کیا و لن یصلح العطاء ما أفسد الدھر دو دن اچھا رہا تو چار دن بیمار رہتا ہوں، لیکن بات چیت کرتا ہوں، لوگ سمجھتے ہیں کہ کوئی شکایت نہیں، نظامِ جسم برہم ہو چکا، ابھی ابھی سردی لگی حالانکہ دوپہر کا وقت ہے۔"
>
> افسوس یہ ہے کہ سیرت پوری نہ ہو سکی، اور کوئی نظر نہیں آتا کہ اس کام کو پورا کر سکے .... اور اگر دار المصنفین قائم ہوا تو تمہارے سوا کون چلائے گا۔"

یہ اکتوبر ۱۹۱۴ء کا خط ہے، ۲۸/ اکتوبر کو لکھا:

> "برادرم، وقت تو یہ تھا کہ ہم چند لوگ یکجا ہوتے اور کچھ کام کرتے لیکن میری دنیا طلبی کا یہ حال ہے کہ خود بے نیاز ہو گیا ہوں، لیکن عزیزوں کی بے تعلقی شاق ہوتی ہے،

سید سلیمان بھی تعلق موجودہ پر راضی نہیں، ذرا اشارہ ہو تو میرے پاس آجائیں، میں
خود روک رہا ہوں۔"

مرا گر تو بگذاری اے نفس طامع بسے بادشاہی کنم در گدائی

اس کے تین ہی ہفتہ کے بعد مولانا شبلی نے ۱۸ رنومبر ۱۹۱۴ء کو انتقال کیا، مولانا حمید الدین صاحب جب پہنچے تو مصنف سیرت کی مقدس زبان خاموش ہو چکی تھی، آنکھیں کھول کر بھائی کی طرف دیکھا اور چپ ہو گئے، اس خاموش نگاہ حسرت میں وصیتوں اور فرمائشوں کے ہزاروں معنی پوشیدہ تھے، جن کو اہل نظر ہی سمجھ سکتے ہیں۔

اس موقع پر ہم جان نثاروں میں صاحب ہوش وہی تھے، ماتم کے آنسو بھی خشک نہیں ہوئے تھے کہ انہوں نے تیسرے دن اس وقت مولانا شبلی مرحوم کے جو چند تلامذہ جمع ہو گئے تھے، ان کی ایک مختصر سی جماعت نعمانیہ بنائی، جس نے اپنا یہ مقصد قرار دیا کہ وہ مولانا شبلی کے ادھورے کاموں کی تکمیل کرے گی، مدرسہ سرائے میر کی صدارت مدرسین مولانا شبلی صاحب متکلم ندوی کے سپرد ہوئی، اس کی نظامت مولانا مسعود علی ندوی نے اپنے سر لی، دارالمصنفین کی تشکیل اور تاسیس کے لیے اسی جماعت کے ارکان نے ماہوار چندے لکھوائے، اور اس کا اہتمام بھی مولانا مسعود علی صاحب ندوی نے اپنے ذمہ لیا، اور سب سے زیادہ یہ کہ شبلی منزل میں ان کاموں کی انجام دہی کی خاطر تنہا قیام گوارا کیا۔

اس کے بعد میں اور وہ دونوں مل کر سرکار عالیہ نواب سلطان جہان بیگم مرحومہ والیہ، عالیہ بھوپال کی طلبی پر بھوپال گئے، سرکار عالیہ نے تسلی دی اور سیرت کی تصنیف کی رقم کو بدستور ہم دونوں کے نام جاری فرما دیا اور یہی دارالمصنفین کے وجود و نشو و نما کے لیے ابر کرم کی پہلی بارش تھی۔

حیدرآباد جا کر مولانا نے کوشش فرمائی، اور نواب عماد الملک کی تائید سے وہ کوشش کام یاب ہوئی، اور مولانا کا تین سو ماہوار کا وظیفہ دارالمصنفین کے نام منتقل ہوا، یہ دارالمصنفین کی بقا کی بہترین ضمانت بنی، اس کے بعد گو باقاعدہ مجلسی انتخاب نہیں ہوا تھا، تاہم ان کی حیثیت صدر مجلس کی اور میری ناظم کی تھی، بعد کو باقاعدہ تاسیس اور وضع دستور العمل کے بعد یہی قانونی شکل بن گئی اور وہ آخر تک دارالمصنفین کی مجلس عاملہ کے صدر نشین رہے۔

مولانا شبلی مرحوم نے اپنے دو مذکورہ بالا آخری خطوط میں جو کچھ لکھا تھا وہ مولانا حمید الدین صاحب مرحوم کی آئندہ زندگی کا نصب العین بن گیا، گودار العلوم حیدر آباد کے تغیر اور جامعہ عثمانیہ کے مفید مبارک تخیل کی سودمندی کی خاطر انھوں نے حیدر آباد کا قیام گوارا کیا، مگر ان کا دل اور کاموں میں لگا تھا۔

مولانا حمید الدین صاحب کے تصور نے مجوزہ دار العلوم کی شکل ہی بدل دی۔ مسلم یونیورسٹی اور ہندو یونیورسٹی کے وجود نے یونیورسٹی کے ''کنزرو ٹیو آئیڈیا'' میں بھی انقلاب پیدا کر دیا، مولانا حمید الدین صاحب ہی تھے، جنہوں نے عصری علوم وفنون کی اردو زبان میں تعلیم کی تجویز پیش کی، اور اس کا خاکہ تیار کیا، ان کا تخیل یہ تھا کہ دینیات کی تعلیم عربی میں ہو اور باقی تمام علوم یہاں تک کہ اصول فقہ بھی اردو میں پڑھایا جائے، لیکن راس مسعود صاحب اور نواب سر حیدر نواز جنگ حیدری صاحب نے ان کے اس تخیل کو کہ علوم کی تعلیم کی زبان اردو ہو، قبول کیا، مگر یہ کہ تمام لڑکوں کو دراصل دینیات کی عربی تعلیم دی جائے قبول نہیں کیا، اور یہی درحقیقت حیدر آباد سے ان کی دل برداشتگی کا سبب ہوا، ۱۹۱۷ء سے جامعہ عثمانیہ کی نصابی کتابوں کے ترجمہ اور اصطلاحات کے وضع کرنے کا کام شروع ہوا، وہ اس مجلس کے رکن تھے، اور وضع اصطلاحات میں مفید مشورے دیتے تھے، اور جامعہ کے نقش تخیل کی رنگ آمیزی میں مصروف تھے، تا آنکہ اگست ۱۹۱۹ء میں باقاعدہ اس کے افتتاح کی نوبت آئی۔

نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی جو اس زمانہ میں صدر الصدور ہو کر حیدر آباد پہنچ چکے تھے اور وہ جامعہ عثمانیہ کے سب سے پہلے وائس چانسلر مقرر ہوئے تھے، وہ اپنے والا نامۂ مذکور میں فرماتے ہیں:

''جامعہ عثمانیہ کی بنیاد رکھنے والوں میں مولانا کے ہاتھ بھی تھے۔''

مگر بعض وجوہ کے باعث یہ ہاتھ فوراً اپنی جگہ سے ہٹ گیا، گوظاہری سبب یہ بھی تھا کہ حیدر آباد کی آب و ہوا مرحوم کو راس نہیں آئی، ان کے درد سر کی عارضی بیماری نے دائمی صورت اختیار کر لی، اس درد کے دورہ سے وہ بے چین ہو جاتے تھے، اور پھر کسی کام کے قابل نہیں رہتے تھے با ایں ہمہ یہاں کے قیام کے دوران میں خرد نامہ یعنی مواعظ سلیمانی کی تکمیل کی اور چھپوائی،

پھر اسباق النحو کے نام سے عربی صرف ونحو کے آسان صورت میں نئے اصول پر اردو میں دو رسالے مرتب کیے اور انجمن ترقی اردو کی طرف سے وہ چھپے، اپنے استاد ادب مولانا فیض الحسن صاحب مرحوم کا عربی دیوان تصحیح کر کے چھپوایا، الرائی الصحیح تصنیف کی، اور تفسیر کے بعض مقدمات لکھے، اسی کے ساتھ درس قرآن کا ایک حلقہ قائم کیا، مغرب کے بعد یہ مجلس جمع ہوتی تھی، مولانا تقریر فرماتے تھے، لوگ شکوک پیش کرتے تھے، وہ جواب دیتے تھے، تھوڑی دیر کے بعد مجلس ختم ہوجاتی تھی، ہمارے فاضل دوست مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی جو اس وقت جامعہ عثمانیہ میں پروفیسر ہیں وہ اس مجلس کے خاص لوگوں میں تھے، ایک دو دفعہ مجھے بھی شرکت کا اتفاق ہوا، کبھی کبھی مولوی وحید الدین صاحب سلیم مرحوم بھی اس میں بیٹھتے تھے۔

مولانا حیدر آباد میں ۱۹۱۹ء تک رہے، اور عین اس وقت جب جامعہ عثمانیہ ہیولیٰ صورت قبول کر رہا تھا، انہوں نے استعفا دے دیا، ذمہ دار ارکان حکومت چاہتے تھے کہ مولانا قیام کریں، مگر وہ اپنی طبعی بے نیازی اور استغنا کو راہ دے کر متوکلاً علی اللہ ایک ہزار ماہوار کی جگہ چھوڑ کر وطن چلے آئے، حیدر آباد میں جب تک وہ رہے، بے ہمہ اور باہمہ رہے۔ علم کی قدر و منزلت اور بے نیازی کو انہوں نے پوری طرح نباہا، اور جو لوگ ان سے ذاتی طور سے واقف تھے اور ان کا حلقہ بہت محدود تھا، ان پر مولانا کی جدائی بڑی شاق گزری، بااین ہمہ وہ ان کے رنگ طبع کو دیکھ کر ان کو مجبور نہ کر سکے۔ مولانا کو حیدر آباد سے نہ کوئی پنشن مل سکی، اور نہ کوئی وظیفہ ہوا، نہ کسی اور قسم کی مالی امداد کے پانے کی انہوں نے کوشش کی، چونکہ وہ الہ آباد یونیورسٹی سے حیدر آباد بھیجے گئے تھے اس لیے الہ آباد یونیورسٹی کی طرف سے کل بتیس تینتیس روپے کی ان کو پنشن ملی۔

اعظم گڑھ واپس آکر مولانا نے اپنے وطن فریہا میں قیام فرمایا، خاندانی موروثی زمین داری کا کچھ کام کبھی کبھی دیکھ لیتے تھے، ایک دو لڑکوں کو کچھ پڑھا دیتے تھے، ورنہ زیادہ تر وقت یاد الٰہی، نماز، تلاوت اور قرآن پاک کے غور وفکر میں بسر ہوتا تھا، اب وقت آیا کہ مولانا مدرستہ الاصلاح سرائے میر کی طرف توجہ فرمائیں۔

مدرستہ الاصلاح سرائے میر

دنیا کا قاعدہ ہے کہ جب تک کسی چیز کا ڈھنڈورا نہیں پیٹا جاتا لوگ اس کو حقیقت باور

نہیں کرتے، تھوڑے کو بہت کر کے دکھانا اس عالم فریب کا خاصہ ہے، مگر مولانا کی طبیعت کا رنگ الگ تھا، وہ اعلان وتعلی سے بہت گھبراتے تھے، اور بہت کو تھوڑا کہہ کر بھی وہ دکھانا نہیں چاہتے تھے۔

مدرسۃ الاصلاح سرائے میر کی بنیاد میں گو بہتوں کا ہاتھ شریک ہو لیکن اس کے تخیل کی تعیین اور اس تخیل کی مطابق مدرسہ کو چلانا، اس کا نصابِ درس بنانا، مدرسوں کو اپنے انوکھے خیال سے متفق کرنا، خاص طلبہ کو اپنے مذاق کی تعلیم دینا اور پورے مدرسہ کو اپنے نہج کے مطابق لے کر چلنا، خاص انہیں کا کام تھا۔

مدرسۃ الاصلاح کیا ہے؟

آج جب کہ ہر بڑے شہر کی گلی گلی میں، بلکہ قصبوں اور دیہاتوں تک میں عربی کے مدرسے قائم ہیں، اور ہر سال ان کی تعداد بڑھتی ہی جارہی ہے، مولانا کا ایک نئے مدرسہ کے قیام پر اپنی زندگی وقف کر دینا، اور اپنی عمر کے آخری پورے بارہ برس اس پر تصدق کرنا کیا معنی رکھتا ہے؟ اس کے جواب میں بجائے اس کے کہ ہم خود کچھ کہیں مدرسہ کی مطبوعہ روداد سے ایک اقتباس نقل کر دیتے ہیں، اور یہ وہ تحریر ہے، جو خود مولانا نے لکھی تھی، یا ان کی فرمائش سے لکھی گئی، اور ان کی نظر سے گزر کر اصلاح پا چکی تھی۔

> ''مسلمانوں کی موجودہ پستی جو ان کی زندگی کے ہر شعبہ پر طاری ہے زیادہ تر نتیجہ ہے اس خرابی کا جو ان کی مذہبی تعلیم میں صدیوں سے پیدا ہو گئی ہے، جب تک مسلمانوں کی مذہبی تعلیم اپنے صحیح نہج پر قائم رہی، وہ برابر دین و دنیا کے تمام شعبوں میں ترقی کرتے رہے، لیکن جب سے یہ شاہ راہ کج ہوئی دینی مدارس اور مذہبی پیشواؤں کی کثرت کے باوجود مسلمانوں کا زوال شروع ہوا، اور برابر بڑھتا گیا.......... ان حالات میں خدا نے ایک جماعت کو اپنی توفیق بخشی سے سرفراز کیا، اور اس نے طے کر لیا کہ جس اسلوب پر علوم دینیہ کی تعلیم ہو رہی ہے، وہ قطعی ناقص اور غیر منتج ہے، جب اسلام ہماری دینی و دنیاوی فلاح کا جامع ہے تو اسلامی تعلیم کے یہی معنی ہوں گے، کہ وہ نہ صرف ہماری عبادت کا دستور العمل ہو، بلکہ زندگی کے تمام شعبوں میں وہ ہمارے

لیے مشعل ہدایت ہو، اب ہمارے درد کا اگر کوئی علاج ہے تو وہ محض رسمی تعلیم اور نصاب مروج کو ختم کرنا نہیں بلکہ مذہبی تعلیم کو اس کے صحیح معنوں میں جاری کرنا ہے، یعنی وہ وسعت و جامعیت جو اسلام کا مفہوم ہے، اور ''تفقہ فی الدین'' اسی سے عبارت ہے، اس جماعت نے اس بلند معیار تعلیم کو پیش نظر رکھ کر ایک مدرسہ کی بنیاد رکھی جس کا نام مدرسۃ الاصلاح ہے۔

مدرسۃ الاصلاح کا دعویٰ ہے کہ اس نے مذہبی تعلیم کی صراط مستقیم کو پالیا ہے، اس نے اسے اپنا مقصد اساسی قرار دیا ہے۔ وہ مقصد اساسی اور وہ صراط مستقیم کیا ہے؟ وہ وہی ہے، جس پر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو چھوڑا تھا، اور جس کی آخری خطبہ میں وصیت فرمائی تھی، کہ میں تمہارے لیے کتاب اللہ چھوڑے جاتا ہوں، جب تک اسے مضبوط پکڑے رہو گے ہرگز گمراہ نہ ہوگے۔ مدرسۃ الاصلاح کا دعویٰ ہے کہ مسلمانوں کے انحطاط وتنزل کا سبب یہی ہے کہ وہ قرآن مجید کی تعلیم کو آہستہ آہستہ کم کرتے گئے، اور وہ علوم جو قرآن مجید کے لیے آلہ اور وسیلہ ہو سکتے تھے، ان کی تحصیل میں اس قدر مصروف ہو گئے کہ وہ خود مقصود بالذات بن گئے، یہاں تک کہ ہوتے ہوتے قرآن مجید کے درس وتدریس کے لیے انہوں نے بالکل جگہ نہ چھوڑی اور اب یہ حالت ہوگئی ہے کہ محض تلاوت وحفظ الفاظ پر اکتفا کر لیا گیا، اور ہم پر رسول خدا کی یہ شکایت منطبق ہونے لگی: يَارَبِّ اِنَّ قَومِیْ اتَّخَذُ و اهٰذَا الْقُرآنَ مَهْجُوْرًا (اے میرے پروردگار! میری قوم نے اس قرآن کو ایک چھوڑی ہوئی چیز سمجھ لیا ہے،) لیکن اللہ تعالیٰ کی توفیق سے مدرسۃ الاصلاح نے یہ راز پالیا اور قرآن مجید کو سرچشمۂ ہدایت وترقی تسلیم کر کے جملہ علوم کی تعلیم اس کی تعلیم کے ماتحت کر دی، وہ ادب، فقہ، حدیث، تاریخ، سیر، منطق وحکمت کی تعلیم دیتا ہے، لیکن اس طور پر کہ جس علم کی طرف قدم بڑھے قرآن کی روشنی میں، اور جو دروازہ کھلے قرآن ہی کے اندر سے کھلے۔''

اس تشریح کے بعد آپ نے سمجھا ہوگا کہ مدرسۃ الاصلاح کیا ہے؟ اور مولانا نے اس

مدرسہ کو ترقی دے کر ملت کی کیا اصلاح کی؟ اور انہوں نے گراں بہا معاوضہ، اعلیٰ اعزاز، دنیاوی منصب اور شہروں کی لذت بخش زندگی کو چھوڑ کر سادگی، قناعت اور گم نامی کے ساتھ اپنی عمر کا ایک جگ کیوں ایک دیہات میں بیٹھ کر عربی کے ایک مدرسہ کی خدمت گزاری میں بسر کر دیا۔

یہ مدرسہ مولانا کے گھر سے ایک اسٹیشن کے فاصلہ پر ہے، مولانا ہر ہفتہ میں تین دن شب و روز مدرسہ میں بسر فرماتے تھے، اور سن کر تعجب ہوگا کہ اس اہتمام کے ساتھ آتے تھے کہ اپنے قیام تک کے لیے کھانا پکوا کر ساتھ لاتے تھے، یا بعد کو پک کر آجاتا تھا، اسی مدرسہ میں مولانا کی ایک چھوٹی سی کوٹھری تھی جس میں وہ قیام فرماتے تھے۔

اس مدرسہ کی بنیاد محض توکل پر ہے، اور مولانا کو اپنے خدا پر یہ اعتماد تھا کہ کبھی مدرسہ کے متعلق ایک دفعہ بھی یہ تصور اپنے دل میں نہیں لائے کہ کل کیا ہوگا، وہ کہتے تھے اور برملا کہتے تھے کہ "خدا دے گا۔" اور یہ ہم سب کا مشاہدہ ہے کہ خدا ان کو دیتا تھا، انہوں نے کبھی اپنے مدرسے کے لیے کسی سے چندہ نہیں مانگا، اور کبھی علم اور قوم کے لیے بھی غیر کے آگے ہاتھ نہیں پھیلایا، ایک دفعہ مدرسہ ہی کی خاطر کلکتہ کی راہ سے رنگون گئے اور مقصد مدرسہ کا سرمایہ ہی تھا، مگر اپنی زبان سے کسی تاجر و سوداگر سے مدرسہ کے لیے تحریک نہیں کی، مگر بہر حال کام یاب آئے۔

انہوں نے سب سے پہلے اپنے مدرسہ کے لیے ایک اچھی خاصی وسیع مسجد بنوائی، اس کے بعد درس گاہ کے لیے ایک چھوٹا سا بنگلہ بنایا، پھر ایک دار الاقامہ بنوایا، جس کی تین سمتیں بن چکی ہیں، ایک باقی ہے، کتب خانہ کے لیے ایک مکان بنوایا، مسجد کے علاوہ تمام عمارتوں کی چھتیں کچی یعنی کھپروں کی ہیں، کتب خانہ میں کچھ کتابیں اوروں کی دی ہوئی ہیں، مگر زیادہ خود اپنا ذاتی کتب خانہ مدرسہ کو عنایت فرما دیا تھا، اور جو ان کی وفات کے بعد مدرسہ کے اندر آ بھی گیا ہے۔

مدرسہ کا ماہانہ خرچ تعمیرات کے علاوہ پانچ چھ سو ہے، بعض مخلصین نے کچھ جائدادیں اعظم گڑھ، رنگون اور کلکتہ میں مدرسہ کے نام وقف کی ہیں، کچھ مدرسہ نے رنگون میں خود خریدا ہے، مگر ہنوز آمد و خرچ برابر نہیں۔ ضلع کے مسلمان سالانہ عشر اور قربانی کی کھالوں اور نقد چندوں سے امداد بھی فرماتے ہیں، تاہم یہ تمام سرمایہ مدرسہ کی روز افزوں ضرورتوں کے لیے کافی نہیں۔

یہ مدرسہ اسٹیشن سرائے میر کے پاس ایک میدان میں واقع ہے، ادھر اُدھر دور تک

آبادی سے خالی ہے، چاروں طرف دور ہٹ کر مسلمانوں کے دیہات ہیں، یہیں کے باشندے اس کے ممبر، خادم اور کارکن ہیں۔ جو موقع پر جمع ہو کر کام کو انجام دیتے ہیں، اور چلے جاتے ہیں۔ انتہائی سادگی اور صفائی اس مدرسہ کا جزءاعظم ہے۔ مدرسین میں بعض پرانے مدرسوں کے تعلیم یافتہ ہیں، چند دار العلوم ندوۃ العلماء کے فارغ التحصیل ہیں، اور بعض خود مدرسہ کے پڑھے ہوئے ہیں، مدرسہ کے سب سے پرانے خادم ایک سادہ وضع بزرگ مولانا محمد شفیع صاحب ہیں، جو نہایت اخلاص کے ساتھ شروع سے آج تک مدرسہ کی نگرانی، اور مالی انتظام کر رہے ہیں۔

مدرسہ کے یہ مدرسین جس سادگی، اخلاص اور ایثار کے ساتھ زندگی بسر کر رہے ہیں، اس کی مثال ہم کو کسی اسلامی درس گاہ میں نہیں معلوم۔ سب سے بڑی تنخواہ اعلیٰ مدرس مولانا شبلی صاحب ندوی کی ہے پینتیس روپئے، درانحالیکہ ان کے پڑھائے شاگرد اور ان کے ساتھی اس سے دوگنی، چوگنی زیادہ تنخواہ پا رہے ہیں۔

مولانا علماء کی گداگرانہ خصلت سے نفرت رکھتے تھے، وہ چاہتے تھے کہ مولویوں کے مدرسہ سے بھی گداگری کی لعنت دور ہو جائے، چنانچہ مدرسہ کے لیے بھی انہوں نے جائداد خریدی، جس کا سال بہ سال منافع آتا ہے، اور صرف اپنی کوشش سے تمام عربی مدارس کے برخلاف اس مدرسہ میں تجارتی و صنعتی آمدنیوں کے ذرائع پیدا کیے، خود اپنی طرف اور مدرسہ کے بعض مخلص ہمدردوں کی طرف سے کچھ سرمایہ لگا کر مدرسہ میں آٹا پیسنے کی مشین مع انجن کے لگایا۔ اور اس سے مدرسہ کو روزانہ کی آمدنی ہو جاتی ہے، مدرسہ کے اندر جوتا بنانے کا ایک شعبہ قائم کیا، جہاں اچھے جوتے پمپ اور شو وغیرہ بنتے ہیں۔

مدرسہ کی تعلیمی کیفیت یہ ہے کہ تمام مدرسین مولانا کے زہد و تقویٰ اور فضل و کمال سے ان کے گرویدہ تھے، سب سے پہلے مدرسین کو اپنا ہم خیال بنایا، ان سے قرآن مجید کے مباحث اور علوم عالیہ کے مسائل میں اپنی تحقیقات بیان فرماتے رہتے تھے، ان کو اپنا طریقہ تعلیم سمجھاتے اور بتاتے تھے، عربی میں صرف و نحو کی تعلیم میں سب سے زیادہ وقت برباد ہوتا تھا، خود مولانا نے صرف و نحو کے دو رسالے لکھے جن کا مدار تمام تر مشق پر ہے، وہ دونوں رسالے وہاں پڑھائے جاتے ہیں، اور وہ کافی ہوتے ہیں، نصاب تعلیم سے تمام غیر ضروری علوم نکال دیے ہیں، قدیم

منطق وفلسفہ کی ایک ایک دو دو کتابیں رہنے دیں ہیں، ادب عربی پر خاص زور دیا، فقہ کی تعلیم فقہ اسلامی کی حیثیت سے دی جاتی ہے، حدیث کسی عصبیت کے بغیر پڑھائی جاتی ہے اور تعلیم کا اصلی مرکز ومحور قرآن مجید کو رکھا گیا ہے۔

مولانا جب تک زندہ رہے خود مدرسین اور اعلیٰ طلبہ کا ایک حلقہ بنا کر اس کو پورے قرآن مجید کا درس کئی دفعہ مختلف نقطۂ ہائے نظر سے دیا۔ ساتھ ساتھ جدید فلسفہ کی بعض شاخیں بھی ان طلبہ کو خود پڑھائیں، چنانچہ بعض مستعد طلبہ نے مولانا کے اس درس سے پورا فائدہ اٹھایا، جن میں قابل ذکر مولوی امین احسن صاحب اصلاحی ہیں، ہماری آئندہ توقعات ان سے بہت کچھ وابستہ ہیں۔

مولانا اخیر عمر میں تصنیف وتالیف کے بجائے اپنا تمام تر وقت انہیں طلبہ کے غور و پرداخت اور تعلیم وتربیت پر صرف فرماتے تھے، اور انہیں کو اپنی زندگی کا ماحصل سمجھتے تھے۔

مولانا حمید الدین فراہیؒ کا مختصر تعارف

(یہ حالات میں نے محض حافظہ کی مدد سے بالکل رواروی میں قلم بند کیے ہیں اور اس میں حد درجہ اختصار کو ملحوظ رکھا ہے۔ اس وجہ سے نہ تو اس میں مولانا کے حالات زندگی کی تفصیل ہی آسکی ہے، نہ واقعات کی تاریخ ہی ہر جگہ متعین ہو سکی ہے اور نہ ہی ان کے علمی کارناموں پر کوئی تبصرہ کیا جا سکتا ہے۔ اس سے مقصود محض ان لوگوں کو مولانا سے فی الجملہ واقف کرنا ہے جو ان سے بالکل ہی ناواقف ہیں۔ امین احسن اصلاحی)

ولادت اور خاندان

مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ ضلع اعظم گڑھ (یو. پی. بھارت) کے ایک گاؤں فریہا میں ۱۲۸۰ھ میں پیدا ہوئے۔ مولانا کا خاندان ضلع کے معزز خاندانوں میں شمار ہوتا ہے، تعلیم اور دنیاوی وجاہت کے اعتبار سے پہلے سے ممتاز رہا ہے۔ مولانا حمید الدین، مولانا شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کے ماموں زاد بھائی تھے۔

مولانا کا نام عبد الحمید بھی ہے اور حمید الدین بھی۔ لیکن حمید الدین چونکہ عربی قاعدہ سے لقب ہے اور لقب کے اظہار میں خود نمائی کا شائبہ تھا۔ اس وجہ سے مولانا اپنے مقدم الذکر نام ہی کو ترجیح دیتے تھے اور اپنی تصنیفات کے سرِورق پر عبد الحمید ہی لکھوانا پسند کرتے تھے۔

ابتدائی تعلیم اور فارسی کی مہارت

مولانا کی ابتدائی تعلیم گھر ہی پر ہوئی۔ سب سے پہلے انہوں نے قرآن حفظ کیا۔ اس کے بعد فارسی زبان کی تحصیل کی۔ فارسی زبان میں بہت جلدی اس قدر ترقی کر لی کہ شعر کہنے لگے۔ شاعری کا مذاق ان میں فطری تھا۔ زبان سے تھوڑی ہی مدت میں اس قدر گہری مناسبت پیدا کر لی کہ اساتذہ کے رنگ میں قصیدہ لکھنے لگے۔ مولانا کے اس زمانہ کا لکھا ہوا ایک قصیدہ مولانا شبلی نعمانی نے اپنے استاذ مولانا فاروق چریا کوٹی کی خدمت میں پیش کیا اور مصنف کا نام بتائے بغیر ان سے پوچھا کہ یہ کس کا کلام ہوسکتا ہے؟ مولانا فاروق چریا کوٹی اپنے زمانہ کے مشہور عالم اور ممتاز نقاد سخن تھے، انہوں نے کلام پر غور سے نگاہ ڈالنے کے بعد کہا کہ میں یہ تو نہیں بتا سکتا کہ یہ کلام کس کا ہے لیکن انداز اور زبان سے پرانے اساتذہ میں سے کسی کا کلام معلوم ہوتا ہے۔

عربی زبان کی تحصیل

عربی زبان کی تحصیل زیادہ تر مولانا شبلی نعمانی سے کی۔ مولانا شبلی نعمانی، مولانا حمید الدین سے چھ سال بڑے تھے اور اپنی غیر معمولی ذہانت اور وقت کے مشاہیر سے کسبِ فیض کے سبب سے علوم عربیہ میں اپنا ایک مقام پیدا کر چکے تھے۔ مولانا حمید الدین سے، رشتہ داری اور ان کے ذاتی اوصاف کے سبب سے، مولانا شبلی کو نہایت گہری محبت تھی اس وجہ سے ایک شفیق بھائی کی طرح انہوں نے پوری توجہ اور نہایت سرگرمی کے ساتھ ان کو تعلیم دی۔ مولانا نے صرف و نحو اور ادب اور معقولات وغیرہ کی تعلیم انہی سے حاصل کی۔ اور اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کی وجہ سے بہت جلد تمام زیر درس علوم میں دست گاہ حاصل کر لی۔

مولانا شبلی کے طریقۂ درس اور مولانا حمید الدین کی استعداد اور ذہانت کا اندازہ کرنے کے لیے ایک واقعہ کا ذکر یہاں غالباً نامناسب نہ ہوگا۔ مولانا نے ایک مرتبہ ذکر فرمایا کہ ادب کی مشہور کتاب مقامات حریری زیر درس تھی۔ مولانا شبلی ہر روز مطالعہ کے لیے کتاب کی ایک خاص مقدار متعین کر دیتے اور شاگرد کے لیے یہ لازمی ہوتا کہ وہ کتاب کا اتنا حصہ بالکل حل کر کے

لائے اور استاد کو سنا دے۔ اگر شاگرد سے عبارت پڑھنے یا اس کا ترجمہ کرنے میں کوئی غلطی ہوتی تو وہ ''ہوں'' کہہ کر ٹوک دیتے۔ مطالعہ یا درس کے لیے جو نسخہ کتاب کا انتخاب کیا گیا تھا وہ اعراب اور حاشیہ وغیرہ سے بالکل پاک تھا۔ اس وجہ سے شاگرد کو محنت تو کافی کرنی پڑتی تھی لیکن مولانا فرماتے تھے کہ میں ہر روز کا کام آسانی سے پورا کر لیتا اور استاد کو کبھی ناخوش ہونے کا موقع نہ دیتا۔ اول تو ان کو ''ہوں'' کہنے کی ضرورت بہت کم پیش آتی اور اگر پیش آتی بھی تو میں فوراً غلطی پر متنبہ ہو کر اس کو درست کر لیتا۔ ایک روز درس ہو رہا تھا کہ ایک لفظ پر استاد نے ''ہوں'' کہہ کر ٹوکا۔ مولانا فرماتے تھے کہ جس لفظ پر استاذ نے ٹوکا تھا اس میں تعلیل کا ایک اشکال تھا اس وجہ سے مجھے گمان ہوا کہ استاذ کو کچھ غلط فہمی ہے۔ میں نے پھر وہی پڑھا استاذ نے پھر ٹوکا۔ لیکن میں نے پھر وہی پڑھا۔ بالآخر استاذ کو غصہ آ گیا اور انہوں نے مجھے کئی چپت رسید کر دیے۔ جب وہ مجھے سزا دے کے فارغ ہوئے تو ان کو از خود اپنی غلطی پر تنبّہ ہوا اور انہوں نے ذرا مجھ سے معذرت کی کہ غلطی میری تھی اور میں نے سزا تم کو دے دی۔ اس واقعہ کے بعد سے میری قوت مطالعہ پر ان کو اس قدر اعتماد ہو گیا کہ وہ مشکل ہی سے مجھے ٹوکتے۔

تکمیل علم کے لیے لکھنؤ اور لاہور کا سفر

مولانا شبلی سے کسبِ فیض کرنے کے بعد مولانا نے وقت کے مشہور اساتذہ کے حلقہ ہائے درس سے مستفید ہونے کا ارادہ کیا۔ اس زمانہ میں مولانا ابوالحسنات عبدالحی لکھنوی فرنگی محلی کے حلقۂ درس کی بڑی شہرت تھی۔ چنانچہ فقہ کی تحصیل کے لیے مولانا نے کچھ مدت تک مولانا عبدالحی مرحوم کے حلقۂ درس میں شرکت کی۔ لیکن مولانا کی طبیعت ابتدا ہی سے تحقیق پسند واقع ہوئی تھی اور ان کے اس ذوق کو مولانا شبلی کے فیض صحبت نے اور زیادہ ابھار دیا تھا اس وجہ سے مولانا لکھنؤ میں کچھ زیادہ نہیں ٹکے۔

لکھنؤ چھوڑنے کے بعد لاہور کا سفر کیا اور لاہور میں مشہور ادیب مولانا فیض الحسن سہارن پوری مرحوم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ مولانا فیض الحسن مرحوم اس وقت اورینٹل کالج لاہور میں پروفیسر تھے اور عربی ادب میں پورے ملک کے اندر اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ ادب

میں مولانا شبلی بھی انہی کے شاگرد تھے۔ مولانا نے ان کی شاگردی سے پورا فائدہ اٹھایا اور مولانا فیض الحسنؒ کی قابلیت اور اپنے حال پر شفقت کا ذکر اکثر فرماتے تھے۔ شاگرد کو استاذ کے ساتھ جو تعلق تھا اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ استاذ کا عربی دیوان شاگرد نے اپنے صرفہ اور اپنے اہتمام سے محض خدمت علم کے لیے شائع کرایا اور ان کی وفات پر مولانا نے عربی میں جو مرثیہ لکھا ہے اس کا ایک ایک شعر درد اور غم میں ڈوبا ہوا ہے۔

استاذ کی نظر میں بھی شاگرد کی بڑی وقعت اور عزت تھی۔ مولانا فیض الحسن صاحب نے اپنی شرح سبعہ معلقہ کا مسودہ، جو خود ان کے اپنے قلم کا لکھا ہوا تھا۔ مولانا کو یادگار کے طور پر دیا تھا اور اس پر خود اپنے قلم سے شاگرد کے لیے جو تعریفی الفاظ لکھے ہیں وہ میری نظر سے گزرے ہیں، وہ الفاظ اس قدر شان دار اور وقیع ہیں کہ ایک شاگرد بجا طور پر ان پر فخر کرسکتا ہے۔ مولانا مرحوم استاذ کی اس یادگار کو نہایت عزیز رکھتے تھے۔ ایک مرتبہ اس نسخہ کی طرف اشارہ کر کے فخریہ انداز میں فرمایا کہ ''یہ میرے استاذ کا بائیں ہاتھ کا کھیل ہے''۔ مولانا کے اس فقرہ میں ایک لطیف تلمیح تھی جس سے سننے والوں میں سے وہ لوگ نہایت محظوظ ہوئے جو اس بات سے واقف تھے کہ مولانا فیض الحسن مرحوم بائیں ہاتھ سے لکھتے تھے۔

انگریزی زبان کی تحصیل

عربی زبان اور دینی علوم کی تحصیل سے فارغ ہونے کے بعد کم وبیش بیس سال کی عمر میں انگریزی زبان کی تحصیل کے لیے علی گڑھ کالج میں داخل ہوئے۔ علی گڑھ کالج میں داخلہ کے وقت مولانا فارسی اور عربی میں جو قابلیت پیدا کر چکے تھے اس کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ خود سرسید مرحوم نے مولانا کے لیے انگریز پرنسپل کو سفارشی خط لکھا اور اس خط میں پرنسپل کو خطاب کر کے یہاں تک لکھ دیا کہ میں آپ کے پاس ایک ایسا طالب علم بھیج رہا ہوں جو عربی اور فارسی میں اتنا قابل ہے کہ آپ کے کالج کے طلبہ میں کُجا پروفیسروں میں بھی کوئی اس کے ٹکر کا نہیں ہے، اس زمانہ میں کالج کے پروفیسروں میں مولانا شبلی صاحب جیسے عربی وفارسی کے یگانۂ روزگار ماہرین شامل تھے۔ انگریز پرنسپل کو سید صاحب مرحوم کی یہ بات شاق گزری۔ وہ خط لیے ہوئے

مولانا شبلی کے پاس پہنچا اور ان کو خط دکھا کر کہا کہ یہ سید صاحب نے ایک طالب علم کے متعلق کیا بات لکھ دی ہے، کیا یہاں کے عربی اور فارسی کے پروفیسر ایک طالب علم کے برابر بھی عربی اور فارسی کی استعداد نہیں رکھتے؟ کیا یہ آپ جیسے اہل علم کی صریح توہین نہیں ہے؟ پرنسپل صاحب اس طرح مولانا شبلی صاحب کو برانگیختہ کرنا چاہتے تھے لیکن مولانا شبلی اس پر برافروختہ ہونے اور جھنجھلانے کے بجائے نہایت پرلطف انداز میں بولے کہ بلاشبہ آپ لوگوں کے لیے تو یہ بات توہین کا حکم رکھتی ہے لیکن میرے لیے یہ بات وجہ فخر ہے، کیونکہ سید صاحب کے یہ ممدوح فارسی اور عربی دونوں میں میرے شاگرد ہیں۔

مولانا کی طالب علمی ہی کے زمانہ میں سرسید مرحوم نے مولانا سے طبقات ابن سعد سے سیرت نبویؐ کا کچھ حصہ فارسی میں ترجمہ کرایا اور اس کی زبان کو اس قدر معیاری پایا کہ اس کو کالج کے نصاب میں داخل کر دیا۔

اسی زمانہ میں سرسید مرحوم امام غزالیؒ کے کسی قلمی رسالہ کو چھپوانے کا اہتمام کر رہے تھے، وہ نسخہ نہایت کرم خوردہ تھا، اس کی تصحیح وتہذیب کے لیے انہوں نے یہ طریقہ اختیار کیا تھا کہ روزانہ کچھ دیر کے لیے مولانا شبلی اور غالباً مولانا حالی کو ساتھ لے کر بیٹھتے اور اس کے مختلف نسخوں کے مقابلہ سے اور کچھ سیاق وسباق سے اس کی کٹی ہوئی یا الجھی ہوئی عبارتوں کو درست کرنے کی کوشش کرتے لیکن یہ کام بڑے دردسر کا تھا اور ان مصروف بزرگوں سے کچھ آگے نہیں سرک رہا تھا۔ بالآخر ایک روز مولانا شبلی نے تنگ آ کر سرسید سے کہا کہ یہ کام حمید کو دے دیجیے وہ کر دیں گے۔ سرسید حیران ہوئے کہ جو کام حالی وشبلی جیسے لوگوں کے لیے مشکل ہے اس کام کو ایک طالب علم کیسے کر دے گا۔ لیکن مولانا شبلی کے کہنے پر ایک روز سرسید مرحوم نے مولانا کو بلا بھیجا اور کتاب کا ایک نسخہ ان کے حوالے کر کے فرمایا کہ اس کے بعض مقامات پر، جہاں الفاظ کٹے ہوئے ہیں، میں نے نشان لگا دیے ہیں۔ آپ غور کر کے متعین کیجیے کہ ان مقامات پر کیا الفاظ مناسب ہوں گے۔ مولانا کتاب ساتھ لے کر چلے آئے اور کتاب کا مطالعہ کرنے کے بعد اپنے ذوق سے ہر جگہ موزوں اور مناسب الفاظ لکھ دیے، چند روز کے بعد جب کتاب سرسید کے حوالہ کی تو انھوں نے کتاب کے دوسرے نسخوں سے نشان زدہ مقامات کا مقابلہ کیا اور سرسید مرحوم کی حیرت کی کوئی انتہا

نہیں رہی جب انہوں نے دیکھا کہ ان کے نشان زدہ مقامات میں مولانا کا قیاس اور ذوق یا تو دوسرے نسخوں کے بالکل مطابق ہے یا کم از کم یہ کہ ان سے قریب تر ہے۔ سر سید مرحوم مولانا کی اس حیرت انگیز قابلیت سے نہایت مرعوب ہوئے اور پوچھا کہ آپ نے ان الفاظ کے متعین کرنے میں کس چیز سے رہ نمائی حاصل کی ہے؟ مولانا نے فرمایا کہ سیاق کلام اور امام غزالی کی زبان دو چیزوں کو سامنے رکھ کر میں نے یہ الفاظ متعین کیے ہیں اور امید ہے کہ اکثر جگہ میرا قیاس درست نکلے گا۔

علی گڑھ میں مولانا نے انگریزی اور دوسرے علوم کے ساتھ ساتھ خاص توجہ کے ساتھ فلسفہ جدیدہ کی تحصیل کی اور اس میں امتیاز حاصل کیا۔ اس زمانہ میں علی گڑھ میں فلسفہ کے پروفیسر مشہور انگریز مستشرق ڈاکٹر آرنلڈ تھے۔ مولانا نے فلسفہ کے درس تو ان سے ضرور لیے لیکن ان سے خوش نہیں تھے۔ وہ آرنلڈ صاحب کو بھی اسی بساط سیاست کا ایک مہرہ سمجھتے تھے جو انگریزوں نے علی گڑھ میں بچھا رکھی تھی۔ علی گڑھ کا حلقہ ڈاکٹر آرنلڈ صاحب کی کتاب پریچنگ آف اسلام (PREACHING OF ISLAM) کا بڑا مداح تھا لیکن مولانا اس کتاب کے سخت مخالف تھے۔ وہ فرماتے تھے کہ یہ کتاب مسلمانوں کے اندر سے روح جہاد ختم کرنے کے لیے لکھی گئی ہے۔

بی اے کی ڈگری مولانا نے الٰہ آباد یونیورسٹی سے لی۔ اس کے بعد ایم اے کے لیے بھی تیاری کی لیکن اس کے امتحان میں نہیں بیٹھے۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہوئی کہ جہاں تک تحقیق وتنقید کا تعلق ہے اس کی راہیں تو ان کے لیے کھل ہی چکی تھیں اب محض ڈگری کی خاطر امتحان دیتے پھرنا ان کی طبیعت کے بالکل خلاف تھا۔

ملازمت

مولانا اگرچہ ایک خوش حال گھرانے سے تعلق رکھتے تھے اس وجہ سے اپنی معاش کے لیے نوکری کے محتاج نہ تھے لیکن بعض خاص اسباب سے جن کی تفصیل یہاں مناسب نہیں ہے انہوں نے تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد یہی بہتر خیال کیا کہ معاش کے لیے کوئی ملازمت اختیار کر لیں، چنانچہ وہ سب سے پہلے مدرستہ الاسلام کراچی میں عربی کے پروفیسر مقرر ہوئے اور

یہاں انہوں نے کئی سال بسر کئے۔

غالباً اسی دوران ۱۹۰۰ء میں ہندوستان کے وائسرائے لارڈ کرزن نے عرب سرداروں سے سیاسی تعلقات قائم کرنے کے لیے سواحل عرب اور خلیج فارس کا سفر کیا۔ اس سفر میں ان کو ترجمانی کے فرائض انجام دینے کے لیے ایک ایسے شخص کی ضرورت پیش آئی جو بیک وقت عربی اور انگریزی دونوں زبانوں کا ماہر ہو۔ اس کے لیے مولانا کا انتخاب ہوا۔ مولانا اگرچہ اس وفد میں شامل ہونے کے لیے راضی نہیں تھے لیکن غالباً مولانا شبلی کے اصرار بلکہ ان کے دباؤ سے مجبور ہوکر ان کو راضی ہونا پڑا۔ اس قسم کا واقعہ اس زمانہ میں کسی شخص کے لیے بھی فخر اور عزت کا ذریعہ ہوسکتا تھا اور اس سے دنیوی فوائد بھی حاصل کئے جاسکتے تھے لیکن مولانا مرحوم نے حکومت کی خواہش کے باوجود نہ تو اس سے کوئی فائدہ اٹھایا اور نہ اس واقعہ کو اپنے لیے کوئی فخر وعزت کی بات سمجھا، بلکہ جہاں تک میرا اندازہ ہے وہ اس کو اپنی ایک سیاسی غلطی سمجھتے تھے اور اس بات کو پسند نہیں کرتے تھے کہ کوئی شخص ان کے سامنے اس کا ذکر بھی کرے۔

علی گڑھ میں قیام

اس سفر سے واپسی کے بعد مولانا علی گڑھ میں عربی کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ علی گڑھ میں اس زمانہ میں عربی کے پروفیسر مشہور جرمن مستشرق یوسف هارویز تھے۔ یوسف هارویز نے مولانا سے عربی زبان کی تکمیل کی اور مولانا نے یوسف هارویز سے عبرانی زبان سیکھی اور اس میں اس حد تک ترقی کرلی کہ عبرانی کتابوں سے براہ راست استفادہ کرنے لگے اور بعد میں اپنی قرآنی تحقیقات میں اس سے پورا فائدہ اٹھایا۔

غالباً اسی زمانہ میں سرسید مرحوم کو اپنی تفسیر قرآن کا عربی میں ترجمہ کرانے کا خیال پیدا ہوا اور اس کام کے لیے لوگوں کی نظرِ انتخاب مولانا پر پڑی، لیکن جب مولانا کے سامنے یہ تجویز رکھی گئی تو مولانا نے فرمایا کہ ''میں اس اشاعتِ معصیت میں کوئی حصہ لینا نہیں چاہتا۔'' مولانا کے اس جواب کے بعد پھر کوئی شخص ان کے سامنے یہ تجویز لانے کی جرأت نہ کرسکا، بلکہ غالباً مولانا کے اس جواب کے بعد تفسیر کے عربی ترجمہ کی تجویز ہی سرے سے ختم ہوگئی۔

حیدر آباد میں قیام

چند سال علی گڑھ میں قیام کے بعد مولانا الٰہ آباد یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر مقرر ہوئے اور پھر وہیں سے ان کی خدمات حیدر آباد نے دارالعلوم حیدر آباد کی پرنسپلی کے لیے حاصل کیں۔ یہ دارالعلوم اس زمانہ میں حیدر آباد کا سب سے بڑا سرکاری مدرسہ تھا جو ریاست کے مختلف شعبوں میں کام کرنے کے لیے آدمی تیار کرتا تھا۔

حیدر آباد کے زمانۂ قیام میں مولانا کے سامنے ایک ایسی یونیورسٹی کا تخیل آیا، جس میں تمام دینی اور عصری علوم کی تعلیم اردو میں دی جائے۔ اگرچہ اس زمانہ میں اردو زبان کو ذریعۂ تعلیم بنانے کے وہ تمام امکانات مفقود تھے جو آج موجود ہیں، لیکن مولانا نے اپنے ٹھوس دلائل سے ریاست کے تعلیمی کارفرماؤں کو اپنے نظریہ کا قائل بنالیا اور اس کی ایک ایسی اسکیم تیار کر کے لوگوں کے سامنے رکھ دی جس کے بعد کسی کو بھی ان کے نظریہ سے اختلاف کرنے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی۔ مولانا کا یہی تخیل تھا جو بالآخر جامعہ عثمانیہ کی شکل میں عملی صورت میں ظاہر ہوا۔

حیدر آباد میں مولانا اپنے علمی و تعلیمی فرائض و مشاغل کے سوا ہر چیز سے نہ صرف بالکل الگ تھلگ رہے بلکہ وہاں کے حالات سے نہایت سخت بیزار بھی رہے۔ اپنے کئی سال کے زمانۂ قیام میں نظام حیدر آباد سے ان کی خواہش کے باوجود ایک مرتبہ بھی ملاقات نہیں کی۔ حیدر آباد کے دوسرے امراء اور نوابوں سے بھی کوئی ارتباط نہیں رکھا صرف خاص خاص اہلِ علم تھے جن سے مولانا کا ملنا جلنا تھا۔ نظام سے ملاقات کے لیے جب مختلف حلقوں سے تحریکیں ہوئیں تو بادلِ ناخواستہ ان سے ملنے پر راضی ہوئے۔ لیکن اس بیزاری کے ساتھ کہ ملاقات کے موقع ہی پر ان کو یہ اطلاع دی کہ "اب میں حیدر آباد سے جا رہا ہوں۔" نظام اس بات کے بڑے خواہش مند تھے کہ مولانا حیدر آباد میں رہیں لیکن مولانا وہاں مزید قیام پر کسی طرح راضی نہ ہوئے۔

جو لوگ اس زمانہ کے حیدر آباد اور اس زمانہ کے نظام حیدر آباد سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ نظام سے اس طرح کی ملاقاتیں کسی شخص کی زندگی میں کیا اہمیت رکھتی تھیں لیکن مولانا کے نزدیک اس کی جو اہمیت تھی اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ جب مولانا ملاقات کر کے نکلے تو غالباً سر اکبر حیدری نے مولانا سے پوچھا کہ "کہیے اعلیٰ حضرت سے کس طرح باتیں

ہوئیں؟'' مولانا نے جواب دیا کہ ''جس طرح آپ سے ہوتی ہیں۔'' سر اکبر حیدری نے اس پر کہا کہ ''اب ہم بے خوفی کے راز سمجھ گئے۔ جو شخص طمع نہیں رکھتا وہ کسی سے نہیں ڈرتا۔''

مدرسۃ الاصلاح اور دار المصنفین

ملازمت سے استعفیٰ دینے کے بعد مولانا اپنے وطن میں آ گئے۔ اب ان کو ذرا فرصت ملی کہ وہ مدرسۃ الاصلاح اور دار المصنفین کی طرف متوجہ ہوئے جن کے انتظامی اور علمی و تعلیمی معاملات ابتداء ہی سے براہ راست مولانا سے متعلق تھے لیکن مولانا حیدر آباد کے تعلق کے سبب سے کماحقہٗ ان کی طرف توجہ نہیں دے سکتے تھے۔

مدرسۃ الاصلاح قصبہ سرائے میر ضلع اعظم گڑھ (یو۔ پی۔ انڈیا) میں ایک دینی درس گاہ ہے۔ یہ درس گاہ مولانا حمید الدین اور مولانا شبلی نعمانی کے تعلیمی نظریات پر قائم ہے۔ ادب عربی اور قرآن مجید کی محققانہ تعلیم اس کا خاص مطمح نظر ہے اور تقریباً پچاس سال سے وہ اس مطمح نظر کی خدمت کر رہی ہے۔ مولانا اس مدرسہ کے ابتدائے قیام سے اس کے ناظم تھے لیکن جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا حیدر آباد کے تعلق کے سبب سے وہ براہ راست اس کی تکمیل و ترقی کی اسکیموں میں بہت کم حصہ لے سکتے تھے۔ حیدر آباد سے ترک تعلق کے بعد وہ اس کے معاملات سے براہ راست دلچسپی لینے لگے اور ۲۵ء سے ۳۰ء (جو ان کا سال وفات ہے) تک تو انہوں نے اپنے وقت اور اپنی محنت کا بڑا حصہ اس مدرسہ ہی کی خدمت پر صرف فرمایا۔ ہر ہفتہ میں تین دن شب و روز مدرسہ ہی پر قیام فرماتے۔ اساتذہ اور منتہی طلبہ کو قرآن مجید کا درس دیتے۔ منتظمین کو اپنے تعلیمی اور اصلاحی نظریات سے آگاہ کرتے اور اگر اس سلسلہ میں ان کے ذہنوں میں کچھ شبہات و شکوک ہوتے تو ان کو دور کرنے کی کوشش کرتے۔ چند آدمیوں کو منتخب کر کے انہوں نے ان کی خاص طور پر تربیت فرمائی تا کہ وہ ان کے طریق فکر و نظر کو اچھی طرح اپنا لیں اور ان کے بعد اس تعلیمی اور فکری اصلاح کو جاری رکھ سکیں جو مولانا نے شروع کیا تھا۔

وفات

مولانا کی عام صحت اچھی تھی۔ وہ ابتدا سے ورزش کے عادی تھے اور ہمیشہ اس کا التزام

رکھتے تھے۔اس کا اثر ان کی صحت پر بہت نمایاں تھا۔لیکن دو بیماریاں ان کو بہت سخت چمٹ گئی تھیں۔ایک درد سر جس کا حملہ اکثر ہوتا رہتا تھا اور جب اس کا حملہ ہوتا تو ان کو بالکل بیکار کر کے رکھ دیتا۔دوسری شکایت ان کو کبھی کبھی پیشاب کے رک جانے کی تھی۔یہ تکلیف ان کو کئی بار ہوئی۔ آخری مرتبہ جب ان کو یہ تکلیف ہوئی تو ان کو آپریشن کرانا پڑا۔آپریشن کے لیے وہ اپنے ایک ہم وطن ڈاکٹر کے پاس اعظم گڑھ سے متھرا گئے۔وہیں آپریشن ہوا اور آپریشن ناکام رہا۔بالآخر وہیں ۱۹ جمادی الثانی ۱۳۴۹ مطابق ۱۱ر نومبر ۱۹۳۰ء کو انتقال فرمایا اور وہیں غریبوں کے قبرستان میں دفن ہوئے۔

تدبر قرآن

یوں تو مولانا فلسفی بھی تھے، متکلم بھی تھے اور عربی اور فارسی کے بے نظیر ادیب اور شاعر بھی تھے۔لیکن یہ ساری چیزیں مولانا کے ہاں ضمناً تھیں۔اصلی چیز جو مولانا کے دل و دماغ اور علم و عمل دونوں پر حاوی تھی، وہ قرآن تھا، قرآن کی ایک ایک آیت بلکہ اس کے ایک ایک لفظ پر انہوں نے اس طرح غور کیا تھا جس طرح اللہ کی اتاری ہوئی کتاب پر غور کرنے کا حق ہے۔ قرآن کو سمجھنے کے لیے انہوں نے نہ صرف قرآن پر غور کرنے کا حق ادا کیا بلکہ ان ساری چیزوں کو بھی نہایت تنقید و تحقیق کی نگاہ سے پڑھا جو قدیم و جدید دونوں راستوں سے ان کو مل سکیں اور جو قرآن کے سمجھنے میں کسی نوعیت سے بھی معین ہو سکتی تھیں۔کلام عرب کا ہر شعر جو قرآن میں سند کے کام آسکتا تھا مولانا کی نگاہ میں تھا۔خطبائے جاہلیت کا ہر خطبہ جو قرآن کے کسی مقام کی تفہیم میں معین ہو سکتا تھا مولانا کے علم میں تھا۔توریت اور تالمود پر وہ عالمانہ نظر رکھتے تھے اور عبرانی سے واقف ہونے کے سبب سے ان سے براہ راست فائدہ اٹھاتے تھے۔تاریخ اور جغرافیہ کے اس سارے حصہ کو وہ اچھی طرح پڑھے ہوئے تھے جس کا کسی نوعیت سے بھی قرآن سے تعلق تھا۔ حدیث، اور فقہ کے ذخیرہ کو انہوں نے قرآن کی کسوٹی پر اچھی طرح پرکھا تھا۔فلسفۂ جدید کی ان تمام شاخوں کا بھی انہوں نے نہایت گہری نظر سے مطالعہ کیا، جو قرآن کے اجتماعی و سیاسی اور مابعد الطبیعی اصولوں کے سمجھنے اور ان کے موازنہ اور مقابلہ میں کارآمد ہو سکتی تھیں۔

مولانا نے قرآن مجید پر غور کرنے کا کام باضابطہ طور پر، جیسا کہ انہوں نے اپنے مقدمہ نظام القرآن میں خود ظاہر فرمایا ہے، اس زمانہ سے شروع کیا ہے جب وہ علی گڑھ میں بحیثیت ایک طالب علم کے مقیم تھے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب سر سید مرحوم مغربی نظریات سے مرعوبیت کے سبب سے قرآن مجید کی من مانی تاویلات کر رہے تھے اور مسلمانوں کا وہ طبقہ جو انگریزوں اور انگریزوں کے لائے ہوئے افکار ونظریات سے مرعوب تھا، بری طرح ان من مانی تاویلات کا شکار ہو رہا تھا۔ مولانا کے اس فتنہ کو جہاں انگریزوں کے تسلط کا ایک قدرتی نتیجہ خیال کیا وہاں اس حقیقت پر بھی ان کی نظر گئی کہ مذہبی علوم خصوصاً قرآن کے سمجھنے سمجھانے کا جو طریقہ مسلمانوں میں رائج اور مقبول رہا ہے وہ بالکل ہی غلط اور فرسودہ ہے۔ اور اس غلط اور فرسودہ طریقہ نے مسلمانوں کے تعلیم یافتہ طبقہ کو فکری اعتبار سے اس قدر کمزور اور منفعل بنا دیا ہے کہ وہ بڑی آسانی سے ہر فتنہ کا شکار ہو سکتے ہیں۔ اس کا علاج اللہ تعالیٰ نے مولانا کے دل میں یہ ڈالا کہ قرآن مجید پر غور کرنے کا وہ صحیح طریقہ اختیار کیا جائے جس سے حکمت قرآن کے دروازے کھلیں تاکہ مسلمان مغرب کی فاسد عقیدت سے مرعوب ہونے کے بجائے قرآن کی صالح عقلیت سے اس کا مقابلہ کر سکیں۔ چنانچہ مولانا نے تفسیروں کے واسطہ سے قرآن کے سمجھنے کا مقبول عام طریقہ چھوڑ کر قرآن پر براہ راست غور کرنے کا طریقہ اختیار کیا اور آہستہ آہستہ اللہ تعالیٰ نے مولانا کی رہ نمائی ان اصولوں تک فرمائی جو انہوں نے اپنے مقدمہ نظام القرآن میں بیان فرمائے ہیں اور جن کی وضاحت میں نے اپنی کتاب تدبر قرآن میں کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہی اصول ہیں جو مولانا نے اپنی اسی تفسیر نظام القرآن میں مدنظر رکھے ہیں جس کے چند اجزا کا ترجمہ اس مجموعہ کی صورت میں شائع کیا جا رہا ہے۔

مولانا نے قرآن مجید پر تدبر کا یہ کام، جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا ہے، اپنی طالب علمی ہی کے زمانہ میں شروع کیا اور اس وقت سے لے کر اپنی زندگی کے آخری لمحات تک برابر اس کام میں لگے رہے۔ مولانا ایک غیر معمولی ذہن ودماغ رکھنے والے آدمی تھے اور اپنے اوقات کا کوئی لمحہ بھی کسی غیر ضروری یا غیر متعلق کام میں صرف نہیں کرتے تھے۔ اس وجہ سے سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر وہ قرآن کے کون سے پہلو ہیں جن پر مولانا نے اپنا یہ پورا وقت صرف کیا؟ اس سوال کا

ایک اجمالی جواب مولانا کی تصنیفات کی اس فہرست سے مل سکے گا جو آگے ہم درج کریں گے۔ اس فہرست سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ مولانا نے تحقیق وتدبر کا جو کام شروع کیا تھا اس کا دائرہ اتنا وسیع تھا کہ اس کی تکمیل کے لیے بالخصوص اس پیمانہ پر جو مولانا کے پیشِ نظر تھا، صرف ایک ہی نہیں بلکہ بہت سی زندگیاں بھی ناکافی تھیں۔

مولانا حمید الدین اور علم حدیث

یہاں ایک فتنہ کی طرف بھی دو لفظوں میں اشارہ کر دینا مناسب ہوگا۔ بعض منکرین حدیث کی طرف سے یہ بات بار بار ظاہر کی گئی ہے کی خدانخواستہ انکارِ حدیث میں مولانا حمید الدین بھی ان کے ہم مذہب تھے۔ اس فتنہ کا آغاز مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم کے ایک مضمون سے ہوا جس میں ضمناً انہوں نے مولانا فراہی مرحوم کے متعلق ایک ایسی بات لکھ دی تھی جو غلط فہمی پر مبنی اور غلط فہمی پیدا کرنے والی تھی۔ اسی بات کو منکرین حدیث لے اڑے اور اس کو انہوں نے انکار حدیث کے ثبوت میں پیش کرنا شروع کر دیا کہ صرف ہم ہی حدیث کے منکر نہیں ہیں بلکہ مولانا حمید الدین فراہی جیسا بلند پایہ محقق اور مفسر بھی حدیث کا منکر تھا۔ میں نے مولانا عبید اللہ مرحوم کے مذکورہ مضمون کے لکھنے کے کچھ ہی دنوں بعد رسالہ معارف (اعظم گڑھ) میں تفصیل کے ساتھ مولانا سندھی کے اس بیان کی تردید کر دی تھی اور اپنے مضمون میں وضاحت کے ساتھ وہ سارے پہلو بیان کر دیے تھے جن کے سبب سے مولانا عبید اللہ مرحوم کو یہ غلط فہمی ہوئی ہوگی۔ میرے اس مضمون سے جہاں تک مولانا عبید اللہ صاحب اور دوسرے صاف ذہن رکھنے والے اہل علم کا تعلق ہے مولانا فراہی مرحوم کی نسبت یہ غلط فہمی دور ہوگئی تھی۔ چنانچہ ۱۹۴۱ء میں مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم سے مجھے لاہور میں ملنے کا موقع ملا تو اثنائے گفتگو میں میرے اس مضمون کا ذکر بھی چھڑا۔ مجھے یاد ہے کہ مولانا سندھی نے اس وقت اس بات پر افسوس کا اظہار کیا کہ ان کے مضمون سے ان کے ایک محبوب دوست (مولانا فراہی مرحوم) کے متعلق غلط فہمی پھیلی۔ لیکن میرے مضمون کو انہوں نے غالباً اس غلط فہمی کے ازالہ کے لیے کافی خیال کیا، اس وجہ سے خود اس مسئلہ پر لکھنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔

میں مولانا فراہی کو مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم اور دوسرے تمام اشخاص سے زیادہ جانتا ہوں۔ میں پورے چھ سال ان کی صحبت میں شب وروز رہا ہوں۔ اس چھ سال کی صحبت میں شاید ہی کوئی صبح وشام ایسی گزری ہو جس میں مجھے علمی ومذہبی اور ادبی وسیاسی مسائل پر ان سے کھل کر بحث کرنے اور ان کے خیالات معلوم کرنے اور اپنے شبہات ان کے سامنے پیش کرنے کا موقع نہ ملا ہو۔ میں پورے وثوق کے ساتھ کہتا ہوں کہ مجھے کبھی ان کی صحبت میں یہ گمان بھی نہیں گزرا کہ مولانا حدیث کے بارے میں اس نقطۂ نظر سے کوئی مختلف نقطۂ نظر رکھتے ہیں جو محققین امت کا ہے۔ انھوں نے حدیث کی تمام کتابوں کو نہایت تحقیق وتنقید کے ساتھ پڑھا تھا۔ وہ بیش تر احادیث کو قرآن سے مستنبط سمجھتے تھے اور اپنی اس سلسلے کی تحقیقات ہمارے سامنے بھی بیان فرماتے تھے۔ اس موضوع پر ان کے مسودات میں ان کی ایک نا تمام تصنیف بھی ہے۔

عمل میں بھی وہ نہایت سخت متبعِ سنت تھے۔ میں ان کی صحبت میں اکثر یہ محسوس کرتا تھا کہ وہ عملی مسائل میں علامہ ابن قیمؒ کی زاد المعاد پیش نظر رکھتے ہیں۔ مولانا کا طرز فکر بالکل حکیمانہ تھا اس وجہ سے سابقہ پڑنے سے پہلے میرا گمان ان کے بارے میں یہ تھا کہ وہ کم از کم فروعی مسائل میں زیادہ جزرسی اور خردہ گیری سے کام نہ لیتے ہوں گے۔ لیکن اتباع سنت کے معاملے میں وہ اپنا اور اپنے شاگردوں اور دوستوں کا تو جزئیات پر بھی احتساب کرتے تھے۔ بعض مرتبہ نئے تعلیم یافتہ حضرات سے اس طرح کے معاملات میں بدمزگی بھی ہو جایا کرتی تھی۔ ایک مرتبہ وہ خود مجھ پر اس بات کے سبب سے معترض ہوئے کہ میرے پائنچے ٹخنوں سے نیچے تھے۔ میں اس زمانہ میں اس طرح کے اعتراضات کو مولویانہ خردہ گیری خیال کرتا تھا چنانچہ میں نے مولانا جیسے حکیم کی طرف سے اس اعتراض کو کچھ عجیب سا محسوس کیا اور اپنے اس احساس کو مولانا پر ظاہر بھی کر دیا۔ گفتگو کچھ بڑھی اور وہ حدیثیں زیر بحث آ گئیں جو اس بارے میں وارد ہیں۔ میں نے ان احادیث سے متعلق اپنا نقطۂ نظر پوری قوت کے ساتھ پیش کیا۔ لیکن مولانا نے جواب میں ایک حکیمانہ بات فرمائی جو میرے دل میں اتر گئی۔ میں نے فوراً عرض کیا کہ اگر یہ بات ہے تو میں اس پر نہایت خوشی سے راضی ہوں کہ آپ اپنے ہاتھ سے میرے پائنچے اتنے کاٹ دیں جتنے حدود شرع سے زائد ہیں۔ مولانا نے فوراً ہنستے ہوئے قینچی منگوائی اور فی الواقع اپنے ہاتھ سے میرے پائنچے اتنے

کاٹ دیے جتنے ٹخنوں سے نیچے تھے۔

اسی طرح ایک مرتبہ ڈاڑھی کے مسئلہ پر بھی بحث چھڑ گئی۔ مولانا دین میں اس کی اہمیت واضح کر رہے تھے اور میں ان کے سامنے یہ بات پیش کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ دین میں ڈاڑھی کی فی الواقع وہ اہمیت نہیں ہے جو اس کو دی جا رہی ہے۔ مولانا کچھ دیر تک تو مجھے ان احادیث کا مطلب سمجھاتے رہے جو اس بارے میں وارد ہیں لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ میں ڈاڑھی کی اہمیت کا کسی طرح قائل نہیں ہو رہا ہوں تو فرمانے لگے کہ اچھا فرض کیا کہ اس کی دین میں بہت زیادہ اہمیت نہیں ہے لیکن کیا اس حقیقت سے انکار کیا جا سکتا ہے کہ یہ چھوٹی سی چیز بہت بڑی بڑی چیزوں کا پتہ دیتی ہے؟ میں نے عرض کیا وہ کیسے؟ فرمایا ''جس طرح راکھ کی ایک چٹکی اڑا کر ہم ہوا جیسی عظیم الشان چیز کا پتہ چلا لیتے ہیں کہ اس کا رخ کدھر کو ہے اسی طرح ایک شخص کے چہرے پر ڈاڑھی کے ہونے اور نہ ہونے سے ہم یہ اندازہ کر لیتے ہیں کہ اس کا میلان کس طرف ہے۔ اسلام کی طرف یا غیر اسلام کی طرف؟'' مولانا کے اس جواب کے بعد میں خاموش ہو گیا اور میں نے یہ محسوس کیا کہ ڈاڑھی چاہے دین میں بجائے خود بہت زیادہ اہمیت رکھنے والی چیز نہ ہو لیکن جہاں تک ایک مسلمان کا تعلق ہے یہ اس کے دل کے رجحانات کے لیے ایک بیرومیٹر (BAROMETER) کا کام ضرور دیتی ہے۔ اور اگر یہ بات ہے تو اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ دین میں اس کی بڑی اہمیت ہے اور ہونی چاہیے۔

ایک ایسا شخص جس کو اتباع سنت اور عمل بالحدیث کا اس درجہ اہتمام ہو، اس پر انکار حدیث کی تہمت لگانا ایک ایسی جسارت ہے جس کا ارتکاب آخرت کی جواب دہی سے بے پروا ہوئے بغیر نہیں کیا جا سکتا۔ مولانا کی بہت سی تصنیفات پہلے سے چھپی ہوئی موجود ہیں اور اب تفسیر نظام القرآن کے بعض اجزا کا اردو ترجمہ بھی ناظرین کے ہاتھوں میں ہے۔ ان کتابوں کو پڑھ کر ہر شخص خود فیصلہ کر سکتا ہے کہ مولانا حدیث کو مانتے تھے یا نہیں مانتے تھے۔ مولانا اپنی ہر بحث میں احادیث سے اسی طرح استدلال کرتے ہیں جس طرح ہمارے دوسرے محقق علماء کرتے ہیں اور اگر کہیں کسی حدیث پر تنقید کرتے ہیں تو اس مقصد کے لیے انہیں اصولوں اور کسوٹیوں کو استعمال کرتے ہیں جن اصولوں اور کسوٹیوں کو ہمارے ناقدین حدیث استعمال کرتے ہیں۔ اس معاملہ

میں کہیں بھی وہ اپنی خواہشوں اور ذاتی آراء و افکار کو دخل انداز ہونے کا موقع نہیں دیتے۔

میں نے چھ سال ان کی صحبت میں رہ کر حدیث کے متعلق ان کا نقطۂ نظر جو کچھ سمجھا ہے وہ یہ ہے کہ وہ سنت کو قرآن کے بعد اسی طرح دین کا دوسرا ماخذ سمجھتے ہیں جس طرح سارے صحیح العقیدہ مسلمان سمجھتے ہیں البتہ وہ علمائے محققین کی طرح روایات کے قبول کرنے میں بڑی احتیاط سے کام لیتے تھے۔ تفسیری روایات کے بارے میں وہ خصوصیت کے ساتھ بہت زیادہ محتاط تھے۔ ان روایات کو وہ ہرگز قبول نہیں کرتے جو صریحاً قرآن کے خلاف پڑتی تھیں۔ تفسیر میں وہ اصل الاصول خود قرآن کے الفاظ، اس کے سیاق و سباق اور اس کے نظم کو قرار دیتے تھے۔ اس کے بعد تبعاً وہ احادیث و روایات کو لاتے تھے۔ اس اصول پر عمل پیرا ہونے کے باوجود مجھے نہیں معلوم کہ انہوں نے کسی آیت کی تاویل کسی صحیح حدیث کے خلاف کی ہو۔ اگر کہیں ان کو کسی صحیح روایت سے مجبوراً اختلاف کرنا پڑا ہے تو انہوں نے تنقیدِ حدیث کے اصول سامنے رکھ کر اس پر تنقید کی ہے اور اپنے اختلاف کے وجوہ دلائل کے ساتھ بیان کیے ہیں۔ جہاں تک قرآن کی اصطلاحات۔ مثلاً صلوٰۃ، صوم، زکوٰۃ، حج، قربانی وغیرہ کا تعلق ہے وہ ان کی تفسیر سو فی صد سنت متواترہ کے مطابق کرتے تھے اور اس کی ادنیٰ خلاف ورزی کو بھی جائز نہیں سمجھتے تھے۔ فقہیات میں بھی ان کا مسلک احتیاط ہی کا تھا۔ اخبار احاد کے بارے میں وہ مالکیہ اور حنفیہ کے مسلک کو ترجیح دیتے تھے۔ جس طرح احناف عام ضرورت کے مسائل میں اور مالکیہ صحابہ کے عام عمل کے مقابل میں اخبار احاد کو بہت زیادہ اہمیت نہیں دیتے اسی طرح مولانا فراہیؒ بھی مذکورہ صورتوں میں اخبار احاد کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ علیٰ ھٰذا القیاس وہ معاملہ کی اہمیت کے اعتبار سے دلیل کی اہمیت کو ضروری قرار دیتے ہیں۔ مثلاً عقائد کے معاملہ میں وہ اس بات کو ضروری سمجھتے ہیں کہ ان کی بنیاد مجرد روایات پر نہیں ہونی چاہیے۔ ان باتوں سے یہ نتیجہ تو ضرور نکالا جا سکتا ہے کہ مولانا روایات کے قبول کرنے کے معاملہ میں شافعی یا حنبلی نہیں تھے، لیکن یہ نتیجہ نکالنا کہ منکر حدیث تھے ایک ایسی جسارت ہے جس کی مثالیں صرف منکرین حدیث ہی کے یہاں مل سکتی ہیں۔

مولانا فراہیؒ اور سیاسیات

مولانا فراہیؒ عملی سیاسیات سے زندگی بھر الگ رہے۔ مدت العمر نہ کسی سیاسی پارٹی

سے وہ وابستہ ہوئے اور نہ خود کوئی سیاسی تنظیم قائم کرنے کے لیے کبھی کوئی قدم اٹھایا، حالانکہ مولانا نظری سیاسیات کے ماہر تھے۔ فلسفہ جدید کی جن شاخوں سے ان کو دلچسپی تھی ان میں فلسفہ سیاست بھی شامل تھا۔ اس فن کی تمام بنیادی کتابیں انہوں نے تنقید کے ساتھ پڑھی تھیں۔ خود مجھے انہوں نے مشہور جرمن فلاسفر بلنچلی کی کتاب تھیوری آف اسٹیٹ (THEORY OF STATE) کا معتدبہ حصہ تنقید کے ساتھ سبقاً سبقاً پڑھایا اور اس کے ضمن میں اسلامی سیاست کے بنیادی مسائل بتائے۔ جس چیز سے نظری طور پر ان کو دلچسپی تھی اس سے عملاً ان کی اس علیحدگی پر مجھے اکثر حیرانی ہوتی تھی۔ بالخصوص جب میں یہ محسوس کرتا تھا کہ وہ وقت کے تمام سیاسی ہنگاموں کو بالکل غلط سمجھتے ہیں اور صحیح راستہ ان کے نزدیک کام کرنے کا کچھ اور ہے، تو اس سے میرے ذہن میں یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ آخر یہ ان غلطیوں کو درست کرنے کے لیے خود کوئی قدم کیوں نہیں اٹھاتے؟ کیا ملک کے مسائل ہمارے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتے؟ کیا اس ملک میں اٹھنے والی تحریکیں ملک کی عام آبادی کے ساتھ کروڑوں مسلمانوں کی زندگیوں پر بھی اثر انداز ہو رہی ہیں؟ کیا مولانا جیسے شخص کے لیے یہ بات جائز ہوسکتی ہے کہ وہ ان ساری چیزوں سے بالکل بےتعلق رہیں اور مسلمانوں کو حالات کی رو میں (جب کہ وہ اس رو کو غلط سمجھتے بھی ہیں) بہہ جانے کے لیے چھوڑ دیں؟ یہ سارے سوالات میرے ذہن میں پیدا ہوتے تھے اور میں مولانا سے ان کا جواب حاصل کرنے کے لیے کبھی کبھی کوشش کرتا تھا اور اس کوشش میں کبھی کبھی مجھ پر جذباتی پن بھی غالب آجایا کرتا تھا۔ لیکن مجھے اعتراف کرنا چاہیے کہ ان سوالوں کا میں ان سے کوئی تشفی بخش جواب نہیں حاصل کر سکا۔

ایک روز مجلس میں اسی طرح کے مسائل زیر بحث تھے۔ مولانا نے وقت کے سیاسی رجحانات پر تنقید کرتے ہوئے مسلمانوں کے لیے جو صحیح طریقہ کار ہوسکتا ہے اس کی وضاحت کی اور اس ضمن میں وقت کے دو بڑے مسلمان لیڈروں کا جن سے مولانا بہت محبت کرتے تھے ذکر فرمایا کہ یہی لوگ ہیں جو مسلمانوں کو غلط راہ پر لے جا رہے ہیں، اگر یہ لوگ چاہیں تو مسلمانوں کو صحیح راستہ پر لگا سکتے ہیں۔ اہلِ مجلس میں سے کسی نے پوچھا کہ مولانا آپ خود ان لوگوں کو سمجھانے کی کوشش کیوں نہیں کرتے؟ تھوڑی دیر تامل کرنے کے بعد فرمایا کہ ''میں ان لوگوں سے ملوں گا اور ان کو سمجھاؤں گا۔'' لیکن پھر تھوڑی دیر توقف کے بعد فرمایا کہ ''اب یہ حضرات ہماری کہاں سنتے ہیں؟''

اس واقعہ سے کچھ ہی پہلے مذکورہ دو بزرگوں میں سے ایک بزرگ سے مولانا کی تفصیلی ملاقات ہوچکی تھی اور ان سے ان مسائل پر تفصیلی گفتگو بھی ہوچکی تھی۔ غالباً اس گفتگو کے بعد مولانا ان حضرات کی طرف سے کچھ زیادہ پر امید نہیں رہ گئے تھے۔

اسی طرح ایک دن ایک مجلس میں مولانا نے خالص شرعی نظام کی ضرورت اور اہمیت پر اس قدر مدلل اور پر زور تقریر کی کہ تمام حاضرین نہایت متاثر ہوئے۔ مجلس میں مولانا کے ایک عقیدت مند اور ہمارے ایک گہرے مخلص پنجابی دوست بھی موجود تھے جو ایک نہایت دین دار اور بے لوث عملی انسان تھے۔ وہ مولانا کی یہ مدلل تقریر سن کر اس قدر متاثر ہوئے کہ انہوں نے کہا کہ اگر شرعی نظام اس قدر ضروری چیز ہے تو بسم اللہ ہاتھ بڑھایئے، میں آپ کے ہاتھ پر بیعت کرتا ہوں، آپ سے بڑھ کر اس کام کے لیے موزوں شخص اور کون ہوسکتا ہے۔ مولانا نے اس وقت تو بات ٹال دی لیکن بعد میں انہوں نے یہ فرمایا کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے اس کام کے لیے نہیں بنایا ہے۔ میں جو خدمت بہتر طور پر انجام دے سکتا ہوں وہ یہ ہے کہ لوگوں کے لیے فہم قرآن کی راہ کھول دوں۔ اگر فہم قرآن کی راہ کھل گئی تو اللہ تعالیٰ صحیح اسلامی طریق پر کام کرنے کے لیے راہیں بھی کھول دے گا۔ مولانا نے یہ بات محض دفع الوقتی کے طور پر نہیں فرمائی تھی بلکہ فی الواقع مسلمانوں کی اصلاح کے سلسلہ میں ان کی رائے ہی یہی تھی۔ اس کا اظہار انہوں نے اپنی بعض کتابوں میں بھی کیا ہے، اور خاص اس سوال پر مولانا نے ایک مضمون بھی لکھا تھا جس کا ترجمہ میں نے رسالہ 'الاصلاح' میں شائع کیا ہے۔

میں نے مولانا کی ان باتوں کو کبھی سخن سازی یا عافیت پسندی کی خواہش پر محمول نہیں کیا کیونکہ میرے نزدیک وہ ان بیماریوں سے بالکل پاک تھے لیکن اس میں بھی ذرا شبہ نہیں ہے کہ عملی سیاسیات سے ان کی بے تعلقی کی یہ توجیہات، جو اوپر مذکور ہوئی ہیں، میری سمجھ میں نہیں آئیں، چنانچہ میں اپنے دل کی اس خلش کو وقتاً فوقتاً ان کے سامنے مختلف طریقوں سے ظاہر کرتا رہا۔ ایک روز میں نے ان سے سوال کیا کہ آپ اپنی تمام چیزیں عربی میں کیوں لکھتے ہیں جب کہ اس ملک کے لوگوں کی عام زبان اردو ہے اور ان کی بھاری اکثریت آپ کے افکار سے فائدہ نہیں اٹھا سکتی؟ انہوں نے اس کا جواب یہ دیا کہ میرے نزدیک ساری خرابی کی جڑ یہ ہے کہ ہمارے

علماء فکری اور عملی دونوں اعتبار سے بالکل غلط راہ پر جا پڑے ہیں، جب تک ان کی اصلاح نہ ہو کوئی اصلاح نہیں ہوسکتی۔ میں پہلے ان کی اصلاح کرنا چاہتا ہوں اور پھر ان کی اصلاح کو مسلمانوں کی اصلاح کا ذریعہ بنانا چاہتا ہوں، اور چونکہ میرے پیشِ نظر تمام عالم اسلامی کے علماء ہیں اس وجہ سے میں نے عربی کو اپنے افکار کے اظہار کا ذریعہ بنایا ہے کیونکہ یہی زبان تمام عالم اسلامی کے علماء کی مشترک زبان ہے۔

مولانا کے اس جواب سے مجھ پر یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہوگئی کہ وہ محض ایک اکیڈمک طرز کے مصنف اور محقق نہیں تھے بلکہ ان کی تمام فکری کاوشوں کے اندر ایک گہرا جذبۂ اصلاح کام کر رہا تھا۔ وہ عملی اصلاح سے پہلے فکری اصلاح کو ضروری سمجھتے تھے اور اس فکری اصلاح کی بنیاد انہوں نے قرآن پر رکھی تھی۔ وہ قرآن کی روشنی میں مسلمانوں کے تمام علوم وافکار کا جائزہ لے کر ایک طرف تو یہ چاہتے تھے کہ فکر ونظر کے مختلف گوشوں میں جو باطل تصورات و نظریات گھس چکے ہیں ان کو بے دخل کریں اور دوسری طرف ان کی کوشش یہ تھی کہ زندگی کے تمام پہلوؤں اور تمام مسائل پر غور کرنے کے لیے قرآن سے رہ نمائی حاصل کرنے کی راہیں کھول دیں۔ یہ کام وہ اپنی زندگی میں کس حد تک انجام دے سکے اس کا اندازہ ان کی تصنیفات کی اس فہرست پر ایک نظر ڈالنے سے ہوسکے گا جو ہم آگے درج کریں گے۔

اخلاق وعادات

مولانا کے متعلق ان کے جاننے والوں میں ہمیشہ یہ بحث رہی ہے کہ ان کا علم زیادہ تھا یا تقویٰ؟ اور واقعہ یہ ہے کہ ان دونوں پہلوؤں میں سے یہ متعین کرنا مشکل ہے کہ ان کی زندگی کا راجح پہلو کون سا تھا؟

مولانا کے رجحانات ابتدا ہی سے نہایت پاکیزہ تھے۔ جو لوگ ان کے بچپنے سے واقف تھے ان کی شہادت بھی یہ تھی کہ وہ شروع ہی سے نہایت ہی نیک، نہایت ہی سلیم الطبع اور ماں باپ کے نہایت فرماں بردار تھے۔ میں نے ان کے ابتدائی رجحانات کا اندازہ کرنے کے لیے ایک مرتبہ ان سے سوال کیا کہ آپ پر سب سے پہلے اور سب سے زیادہ کس کتاب نے اثر

ڈالا ہے؟ مولانا نے جواب دیا: قصص الانبیاء نے۔ مولانا اپنے بچپنے میں یہ کتاب اپنی پھوپی کو، جوان سے بہت زیادہ محبت کرتی تھیں۔ سنایا کرتے تھے۔ مولانا فرماتے تھے کہ وہ اس کتاب کے واقعات سے بہت زیادہ اثر لیتی تھیں اور اسی طرح مجھ پر بھی انبیاء کرام کے قصوں کو پڑھ پڑھ کر یہ اثر پڑتا تھا کہ دنیا میں آدمی کو انہی لوگوں کی طرح خلق سے محبت کرنے والا اور خدا سے ڈرنے والا بننا چاہیے۔

سچائی اور صبر کی عادت مولانا میں ابتدا سے نہایت پختہ تھی۔ سختیوں اور تکلیفوں کو برداشت کرنے اور ہر موقع پر سچ بولنے میں انہوں نے اس وقت بھی کوئی کمزوری نہیں دکھائی جب وہ ذہنی اور علمی اعتبار سے بھی خام تھے۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ جن مواقع پر لوگ جھوٹ بول دینے میں کوئی ہرج نہیں سمجھتے میں ان مواقع پر بھی ہمیشہ سچ ہی بولنے کی کوشش کرتا تھا اور میرا ابتدا سے تجربہ ہے کہ سچ بولنے والا کبھی خسارہ میں نہیں رہتا۔ ایک مرتبہ انہوں نے اپنا ایک دلچسپ واقعہ بھی سنایا۔ فرماتے تھے کہ جب میں مولانا فیض الحسن مرحوم سے ادب کی تحصیل کے لیے لاہور روانہ ہونے لگا اور والدہ سے رخصت ہو کر زنان خانہ سے باہر نکلا تو دروازہ پر والد نے پوچھا کہ ”بیٹے تمہاری والدہ نے تم کو کتنے روپے دیے؟ مولانا نے فرمایا کہ والد کے اس سوال پر میں نے خیال کیا کہ اگر میں نے والدہ کی دی ہوئی رقم ٹھیک بتا دی تو ممکن ہے والد جو کچھ دینے والے ہیں اس میں کچھ کمی کر دیں، لیکن مجھے جھوٹ بھی نہیں بولنا تھا اس وجہ سے میں نے صاف صاف کہہ دیا کہ ”میں نہیں بتاؤں گا۔“ مولانا فرماتے تھے کہ والد میرے اس بے ساختہ جواب سے نہایت خوش ہوئے اور نہایت محبت سے فرمایا کہ حمید جھوٹ نہیں بول سکتے، اور خوش ہو کر میری توقع سے زیادہ مجھے روپے دیے۔

مولانا نہایت عقلیت پسند اور فلسفی مزاج ہونے کے باوجود الحاد اور تشکیک کے حملہ سے برابر محفوظ رہے۔ زندگی کے کسی دور میں بھی ان کا تعلق خدا سے نہیں ٹوٹا۔ میں نے ایک مرتبہ مولانا سے سوال کیا کہ آپ پر کوئی دور بے قیدی اور آزادی کا بھی گزرا ہے؟ فرمایا نہیں۔ پھر فرمایا کہ جس زمانہ میں علی گڑھ میں پڑھتا تھا اس زمانہ میں ایک مرتبہ میرے ذہن میں یہ سوال ضرور پیدا ہوا تھا کہ خدا ہے یا نہیں؟ فرماتے تھے کہ اس سوال پر کوئی دو گھنٹے میں برابر غور کرتا رہا بالآخر

میں یہ فیصلہ کر کے اٹھا کہ خدا ضرور ہے۔ اس کے بعد پھر مجھے اس سوال نے کبھی پریشان نہیں کیا۔

معاملات میں مولانا حد درجہ کھرے اور نہایت انصاف پسند تھے۔ اس بات کا سخت اہتمام رکھتے تھے کہ کسی کا ایک پیسہ بھی ان کی ذمہ باقی نہ رہے۔ ان کے انصاف پر مخالفوں کو بھی پورا بھروسہ تھا۔ خود مولانا کے والد کے خلاف جائداد کا ایک مقدمہ تھا۔ اس مقدمہ میں فریق مخالف نے مولانا کو حکم مان دیا۔ مقدمہ فیصلہ کے لیے عدالت سے مولانا کے پاس منتقل ہو گیا اور مولانا نے اس کا فیصلہ اپنے والد کے خلاف کر دیا جس کے نتیجہ میں مولانا کے والد کی جائداد کا ایک اچھا خاصہ حصہ (جو بالآخر مولانا ہی کی طرف منتقل ہوتا) ان کے قبضہ سے نکل گیا۔

مولانا ایک خوش حال گھرانے سے تعلق رکھنے اور بیش قرار تنخواہ پانے کے باوجود زندگی نہایت سادہ اور طالب علمانہ بسر کرتے تھے۔ مکان میں معمولی فرنیچر ہوتا، کپڑے نہایت سادہ پہنتے، کھانے میں بھی کسی تکلف کے عادی نہیں تھے۔ تنخواہ کا بیش تر حصہ یا تو کتابوں کی خرید اور ان کی پر تکلف جلدوں پر خرچ ہوتا تھا یا پھر مستحقین خصوصاً غریب اہل علم اور نادار شرفاء کی امداد پر اور اس دوسری مد کا خرچ ان کے ہاں کافی وسیع تھا۔

مولانا کی زندگی کے آخری پانچ چھ سال میری آنکھوں کے سامنے گزرے ہیں۔ اس دور میں انہوں نے اپنی زندگی کا معیار تقریباً وہی بنالیا تھا جو مدرسۃ الاصلاح (سرائے میر اعظم گڑھ) کے غریب اساتذہ اور طلبہ کا تھا۔ ہمارے ہی ساتھ بیٹھ کر جو دال دلیا میسر آتا کھالیتے۔ ہماری ہی طرح سادہ اور غریبانہ کپڑے پہنتے، ہمارے ہی ساتھ ٹاٹ پر بیٹھتے۔ ان کی باعظمت پیشانی اور ان کے نورانی چہرہ کے سوا اور کوئی چیز بھی ایسی نہیں تھی جس سے ایک اجنبی ہمارے درمیان ان کی بڑائی کا اندازہ کرسکتا۔ اور یہ تو ان کو دیکھ کر کسی کو گمان بھی نہیں ہوسکتا تھا کہ علوم مشرقیہ اور علوم مغربیہ کا یہی وہ مجمع البحرین ہے جو مولانا شبلی نعمانی جیسے محقق کا مرجع استفادہ رہ چکا ہے اور جس کے تعلیمی نظریات کی داغ بیل پر جامعہ عثمانیہ حیدرآباد جیسی عظیم الشان یونیورسٹی کی بنیادیں رکھی گئی ہیں۔

مولانا حد درجہ خلوت پسند تھے، عام لوگوں سے ان کا ملنا جلنا بہت کم تھا۔ وہ اپنے شاگردوں اور اہل علم ہی کی مجلس میں بیٹھنا پسند فرماتے تھے۔ گفتگو ہمیشہ علمی اور بہت مختصر کرتے تھے۔ ان کی مجلس میں ہجو، غیبت اور طعن و تشنیع کا کبھی گزر بھی نہیں ہوتا تھا۔ اگر مجلس میں گفتگو کبھی

علمی اور مذہبی حدود سے متجاوز ہوتی نظر آتی تو نہایت خوب صورتی کے ساتھ اس کو مذہبی اور علمی رخ کی طرف موڑ دیتے، گویا بلا ارادہ بات میں سے بات پیدا ہوگئی ہے۔

معمول یہ تھا کہ شب میں ڈھائی تین بجے اٹھ جاتے۔ شب بیداری کی یہ عادت انھوں نے بچپنے میں ڈالی اور آخر عمر تک برابر قائم رہی۔ اسی وقت اپنی چار پائی اور اپنا بستر وغیرہ خود ٹھیک کر لیتے کہ شاگردوں یا ملازم کو کوئی زحمت نہ اٹھانی پڑے۔ اس کے بعد تہجد پڑھتے اور اس سے فارغ ہونے کے بعد اگر طبیعت اچھی ہوتی تو کچھ تصنیف کا کام کرتے۔ دن میں وہ تصنیف کا کام بہت کم کرتے تھے۔ دن میں زیادہ تر مطالعہ کرتے یا شاگردوں اور اہل علم حضرات کو وقت دیتے۔

یوں تو ان کی مجلس میں ہر قسم کے علمی موضوعات پر گفتگو رہتی تھی لیکن خاص موضوع قرآن ہوتا تھا۔ مطالعہ کے لیے ہمیشہ اونچے درجہ کی چیزیں منتخب کرتے تھے اور ہر چیز کو نہایت گہری تنقید کے ساتھ پڑھتے تھے۔ کتاب انگریزی ہو یا عربی اس کے حاشیہ پر عربی میں اس کے تمام اہم مباحث پر اپنے تنقیدی نوٹ لکھتے جاتے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی پڑھی ہوئی کتابیں اہل علم کے لیے بڑی قیمتی چیزیں بن جاتی تھیں۔ میں نے مولانا کو کبھی دوسرے درجہ کی کوئی چیز پڑھتے نہیں دیکھا۔ یہی ہدایت وہ برابر اپنے شاگردوں کو بھی کرتے رہتے تھے۔

سب سے زیادہ خاص چیز جو میں نے مولانا میں محسوس کی یہ ان کا وہ اثر تھا، جو ان کی صحبت میں بیٹھنے والے پر پڑتا تھا۔ آدمی ان کے پاس بیٹھ کر فی الواقع دنیا اور دنیا کی تمام دلچسپیاں بھول جاتا تھا۔ خدا کا بھروسہ طبیعت پر اس قدر غالب آجاتا کہ وہ ساری مشکلیں جن سے ابھی گردن ٹوٹی جاتی تھی ان کے پاس بیٹھتے ہی ایسا محسوس ہونے لگتا کہ وہ پر کاہ کے برابر بھی اہمیت نہیں رکھتیں۔ خدا کی محبت اور آخرت کی طلب کا دل میں ایسا جوش ابھرتا کہ آدمی کو اپنی غفلت کی ساری زندگی سے نفرت ہوجاتی۔ مولانا شبلی نعمانی مرحوم کے متعلق مشہور ہے کہ وہ مولانا کی نسبت فرمایا کرتے تھے کہ ''حمید کے پاس بیٹھ کر آدمی کا دل دنیا سے اچاٹ ہوجاتا ہے۔'' مولانا کی صحبت میں بیٹھنے والوں میں سے ہر شخص مولانا شبلی نعمانی مرحوم کے اس قول کی سچائی کا اعتراف کرے گا۔ مولانا کی وفات کے بعد میں ایک مخدوم بزرگ کی خدمت میں جب کبھی حاضر ہوتا تو

اکثر وہ یہ فرماتے کہ تعال نو من ساعۃ (آؤ تھوڑی دیر اسلام تازہ کرلیں) اور اس سے ان کا مقصد یہ ہوتا کہ مولانا کے حالات زندگی بیان کر کے اس سے اپنے اندر کچھ حرارتِ ایمانی پیدا کرنے کی کوشش کریں۔

تصنیفات

مولانا ان معنوں میں مصنف نہیں تھے جن معنوں میں لوگ عموماً مصنف ہوا کرتے ہیں۔ وہ محض لکھنے کی خاطر لکھنے کے قائل نہیں تھے۔ وہ لکھنے کے لیے صرف اس وقت قلم اٹھاتے تھے جب ان کے سامنے کوئی نئی تحقیق آتی تھی۔ ان کو ایک مصنف کے بجائے ایک مفکر اور ایک فلسفی کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔ وہ لکھنے سے زیادہ غور کرتے تھے اور یہ غور وفکر بیک وقت مختلف مباحث پر جاری رہتا تھا۔ مولانا ان سارے مسائل کو الگ الگ عنوان بحث وتحقیق قرار دے لیتے اور ان کے متعلق اپنے نتائج افکار جمع کرتے جاتے۔ جب کوئی بات ذہن میں آتی اس کو فوراً کسی رقعے یا پرزے پر ٹانک لیتے۔ لکھتے ہمیشہ پنسل سے تھے لیکن نہایت خوش خط اور خوش سواد تھے اس وجہ سے ان کی لکھی ہوئی تحریریں پڑھنے میں کوئی زحمت نہیں ہوتی تھی۔ اس طرح کی جو یادداشت لکھتے اس پر اسی وقت یہ بھی نوٹ کر دیتے کہ یہ کس کتاب سے متعلق ہے۔ یہ یادداشتیں گویا اس کتاب کی فصلیں ہوتیں۔ اس طرح جب کسی کتاب کی تمام فصلیں ان کے ذہنی خاکہ کے مطابق پوری ہوجاتیں تو ان یادداشتوں کو کچھ کم وبیش کر کے مرتب کر دیتے اور کتاب تیار ہوجاتی۔ مولانا کے اس مخصوص طریقۂ تصنیف کے سبب سے بیک وقت ان کے زیر قلم یا صحیح تر الفاظ میں ان کے زیر فکر متعدد تصنیفات رہتی تھیں جن میں سے بعض تکمیل کو پہنچ جاتی تھیں، بعض چلتی رہتی تھیں اور بعض آخر تک ایک آدھ فصلوں سے آگے نہ بڑھ سکیں۔

ہم یہاں مولانا کی صرف ان تصنیفات کا ذکر کریں گے جو یا تو مکمل ہو کر شائع ہو چکی ہیں یا شائع تو نہیں ہوئی ہیں لیکن ان کا معتدبہ حصہ یا تو مولانا لکھ چکے تھے یا ان سے متعلق ان کی یادداشتوں کا کافی ذخیرہ موجود ہے۔ جن کو ایک مناسب ترتیب کے ساتھ اگر شائع کر دیا جائے تو اہل علم کے لیے وہ نہایت قیمتی ذخیرۂ تحقیق فراہم کر سکتی ہیں۔

مولانا کی مطبوعہ کتابیں

۱- **تفسیر نظام القرآن وتاویل الفرقان بالفرقان**: مولانا کی تفسیر نظام القرآن کے چند اجزا اصل عربی میں شائع ہو چکے ہیں۔ ان کا اردو ترجمہ بھی ارباب نظر کی خدمت میں پیش کیا جا چکا ہے۔ اس کے مطالعہ سے ناظرین اس تفسیر کی نوعیت کا اندازہ خود کرسکیں گے۔ ان اجزا کے علاوہ تفسیر سورۂ بقرہ اور سورۂ آل عمران کا کچھ حصہ مسودہ کی صورت میں موجود ہے۔ باقی سورتوں کی خاص خاص مشکلات اور ان کے نظام پر مولانا کی یادداشتیں موجود ہیں۔

۲- **فاتحہ نظام القرآن**: اس مجموعہ میں تفسیر نظام القرآن کا مقدمہ ہے جس میں مولانا نے اپنے اصول تفسیر سے بحث کی ہے۔ نیز یہ آیت بسم اللہ اور سورۂ فاتحہ کی تفسیر ہے۔ اس کا اردو ترجمہ بھی مجموعہ تفاسیر فراہیؒ میں شامل ہے۔

۳- **مفردات القرآن**: اس رسالہ میں مولانا نے قرآن مجید کے بعض مشکل الفاظ کی، جن کے بارے میں وہ دوسرے مفسرین اور عام اہل لغت سے اختلاف رکھتے ہیں، تحقیق بیان کی ہے، اور کلام عرب سے اپنے قول کی تائید میں دلائل پیش کیے ہیں۔

۴- **الامعان فی اقسام القرآن**: اس رسالہ میں مولانا نے پہلے قسم کی حقیقت اور اس کے مختلف قسموں پر اصولی بحث کی ہے۔ اس کے بعد ان قسموں کی حقیقت واضح کی ہے جو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں کھائی ہیں۔ اس رسالہ کا اردو ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے۔

۵- **الرأی الصحیح فی من هو الذبیح**: اس رسالہ میں پہلے قربانی کی حقیقت اور اسلام میں اس کی اہمیت پر بحث کی گئی ہے۔ اس کے بعد توریت اور قرآن مجید کے دلائل سے نہایت تفصیل کے ساتھ ثابت کیا گیا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے جس بیٹے کی قربانی کی وہ حضرت اسمٰعیلؑ ہیں نہ کہ حضرت اسحٰقؑ، جیسا کہ یہود کا دعویٰ ہے۔
مولانا شبلی نعمانی مرحوم نے سیرت النبیؐ میں حضرت ابراہیمؑ و حضرت اسماعیلؑ پر جو معرکہ آرا بحث لکھی ہے وہ تمام تر اسی رسالہ سے ماخوذ ہے۔ میرے قلم سے اس کا اردو

ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔

۶- **جمهرة البلاغة**: اس کتاب میں مولانا نے مروجہ علم بلاغت کو، جو سکاّ کی اور جرجانی کی کتابوں میں ہے، یونانیوں سے ماخوذ ثابت کیا ہے اور یہ دکھایا ہے کہ عربی ادب خصوصاً قرآن حکیم کی خوبیوں کو جانچنے کے لیے یہ فن بلاغت کسی طرح کسوٹی کا کام نہیں دے سکتا۔ ساتھ ہی فصحائے عرب کے کلام سے بلاغت کے وہ اصول متعین کیے ہیں جو قرآن کی بلاغت کو پرکھنے کے لیے معیار کا کام دے سکتا ہے۔

۷- **اسباق النحو** (حصہ اول و دوم): ان دونوں کتابوں میں مولانا نے ابتدائی نحو و صرف کو نہایت ہی سائنٹفک اور آسان طرز پر مرتب کر دیا ہے اور تجربہ نے ثابت کر دیا ہے کی نحو وصرف کی ابتدائی تعلیم کے لیے یہ دونوں رسالے نہایت مفید ہیں۔

۸- **دیوان حمید**: مولانا کے فارسی کلام کا مجموعہ۔

۹- **خرد نامہ** :امثال سلیمانؑ کا خالص فارسی (دری زبان) میں منظوم ترجمہ۔

۱۰- **شفاعت اور کفارہ کی تردید میں ایک رسالہ** (بہ زبان انگریزی): نصاریٰ کے عقیدۂ شفاعت اور کفارہ کی تردید میں مولانا نے یہ رسالہ انگریزی میں لکھا۔

مولانا کی غیر مطبوعہ کتابیں

مولانا کی تصنیفات کا جو ذخیرہ ابھی مسودات کی صورت میں پڑا ہوا ہے اس کی فہرست بھی اچھی خاصی لمبی ہے۔ ہم اس میں سے یہاں چند ایسی کتابوں کا ذکر کرتے ہیں جو اگرچہ ناتمام ہیں لیکن اس ناتمام حالت میں بھی اگر ان کی اشاعت ہو سکے تو اہلِ علم کے لیے وہ گراں مایہ دولت ہیں۔

۱۱- **تفسیر نظام القرآن وتاویل الفرقان بالفرقان**: سورۂ بقرہ اور سورۂ آل عمران کی تفسیروں کا تھوڑا تھوڑا حصہ موجود ہے۔ ان کے علاوہ قرآن مجید کی اکثر سورتوں کی اہم مشکلات اور ان کے عمود اور نظام سے متعلق مولانا کی یادداشتوں کا ذخیرہ ہے۔

۱۲- **دلائل النظام**: اس کتاب میں مولانا نے اپنے اس دعویٰ کو کہ قرآن میں نظم ہے نہایت مضبوط دلائل سے ثابت کیا ہے اور مشکلات نظم حل کرنے کے لیے اصول بیان

کر کے قرآن کی مثالوں سے ان کو اچھی طرح واضح کیا ہے۔

۱۳- **اسالیب القرآن**: قرآن میں زبان کے بہت سے ایسے اسلوب استعمال ہوئے ہیں جو صرف عربی زبان اور قرآن مجید کے ساتھ مخصوص ہیں۔ مولانا نے کلام عرب اور قرآن کی مثالوں سے ان اسالیب کو اچھی طرح واضح کر دیا ہے تا کہ ان کے نہ سمجھ سکنے کی وجہ سے تاویل کی جو مشکلیں پیدا ہوتی ہیں وہ دور ہو جائیں۔

۱۴- **التکمیل فی اصول التاویل**: اس رسالہ میں مولانا نے وہ اصول بیان کیے ہیں جو قرآن کی تاویل میں پیش نظر رکھنے چاہئیں؟ اور جن کو خود انہوں نے اپنی تفسیر نظام القرآن میں پیش نظر رکھا ہے۔

۱۵- **القائد الی عیون العقائد**: اس میں مولانا نے دین کے اصولی مباحث توحید، رسالت اور معاد وغیرہ پر قرآنی دلائل کی وضاحت کی ہے اور ہمارے جدید علم کلام کو جن اصولوں پر مرتب ہونا چاہیے ان کی طرف رہ نمائی فرمائی ہے۔

۱۶- **حجج القرآن**: اس میں مولانا نے پہلے منطق، فلسفہ قدیم اور فلسفہ جدید کی خامیوں سے بحث کی ہے، اس کے بعد قرآنی فلسفہ کے اصول بیان کر کے ان کی عقلی قدر و قیمت واضح کی ہے۔

۱۷- **رسالۃ فی حکمۃ القرآن**: اس میں مولانا نے حکمت قرآن اور اس کے استنباط کے طریقوں کی وضاحت کی ہے۔

۱۸- **فی ملکوت اللہ**: اس میں مولانا نے پہلے ان قوانین کی وضاحت کی ہے جو قوموں کے عروج و زوال اور حق کی فتح اور باطل کی شکست سے متعلق قرآن میں بیان ہوئے ہیں اور پھر ان کی روشنی میں اسلامی نظام سیاست کی وضاحت کی ہے۔

۲۰- **دیوان ابی احمد الانصاری**: یہ مولانا کا عربی دیوان ہے۔ اس میں مولانا کا وہ مشہور قصیدہ بھی ہے جو مولانا نے طرابلس کے خونیں حوادث پر لکھا تھا اور جس کا ایک ایک شعر خون جگر سے لکھا گیا ہے۔ مولانا کا یہ قصیدہ جب شیخ سنوسی نے سنا تو ان کی آنکھیں اشک بار ہو گئیں۔ اسی طرح کی چیزوں کے سبب سے ایک زمانہ میں

انگریزی حکومت کی سی آئی ڈی مولانا پر مستقلاً مسلط رہتی تھی۔

ذیل میں مولانا کی بعض ان کتابوں کی فہرست ہے جن کی چند فصلوں اور کچھ یادداشتوں سے زیادہ وہ نہ لکھ سکے لیکن یہ منتشر فصلیں اور غیر مرتب یادداشتیں اس قدر قیمتی ہیں کہ ان کی مدد سے ان مباحث پر بہت کچھ کام کیا جا سکتا ہے۔

۲۱- الرائع فی اصول الشرائع

۲۲- احکام الاصول باحکام الرسول : اس میں مولانا اس بات کی وضاحت کرنا چاہتے تھے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو تعلیمات اور ہدایات دی ہیں وہ تمام تر قرآن سے مستنبط ہیں۔

۲۳- کتاب العقل ومافوق العقل

۲۴- الاکلیل فی شرح الانجیل: اس میں مولانا نے انجیل کے ان الفاظ اور عبارتوں کی شرح کی ہے جن کی نصاریٰ نے خاص طور پر تحریف کی ہے۔

۲۵- اسباب النزول : اس میں آیات قرآن کے شانِ نزول سے متعلق مولانا نے اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کی ہے۔

۲۶- تاریخ القرآن: معلوم ہوتا ہے مولانا قرآن کی جمع و ترتیب سے متعلق اپنا نظریہ اس میں خود قرآنی دلائل سے ثابت کرنا چاہتے تھے۔

۲۷- اوصاف القرآن

۲۸- فقه القرآن: اس میں مولانا فقہی مسائل سے متعلق اپنے لطیف استنباطات جمع کرنا چاہتے تھے۔

۲۹- رسالة فی اصلاح الناس : اس میں مولانا نے مسلمانوں کی اصلاح سے متعلق اپنا نقطۂ نظر بیان فرمایا ہے۔ اس کا ترجمہ میرے قلم سے رسالہ الاصلاح میں شائع ہو چکا ہے۔

۳۰- الازمان و الادیان : اس رسالہ میں اس امر سے بحث کی ہے کہ دین میں خاص خاص مہینوں، دنوں، تاریخوں اور اوقات کا جو اہتمام ہوتا ہے اس میں کیا رمز ہے۔

۳۱- **فلسفة البلاغة**: اس کے مباحث مولانا کی کتاب جمہرۃ البلاغہ میں آ چکے ہیں جو چھپ کر شائع ہو چکی ہے۔

۳۲- **سليقة العروض** : مولانا نحو اور صرف کی طرح فن عروض کو بھی سائنٹفک طریقہ پر مرتب کر دینا چاہتے تھے تا کہ طلبہ کو اس کے سیکھنے میں کوئی زحمت باقی نہ رہے۔

۳۳- **النحو الجدید**: نحو وصرف کی ترتیب کے سلسلہ میں اسباق النحو کے دو حصوں کے بعد مولانا کا یہ دوسرا قدم تھا۔ اگر یہ کتاب تکمیل کو پہنچ گئی ہوتی تو جہاں تک نحو کا تعلق ہے یہ کتاب طلبہ کو دوسری تمام کتابوں سے بالکل مستغنی کر دیتی۔

اس فہرست پر ایک نظر ڈال کر ہر شخص اندازہ کر سکتا ہے کہ مولانا قرآن حکیم کو مرکز بنا کر تمام اسلامی علوم کو از سر نو مرتب کرنا چاہتے تھے تا کہ آدمی پر جو دروازہ بھی کھلے وہ قرآن کی راہ سے کھلے اور وہ جس راہ میں بھی چلے قرآن کی روشنی اس کی رہ نمائی کرے۔ یہ ساری جد و جہد مولانا مسلمانوں، خصوصاً علماء کے اندر، ایک صحیح قسم کا فکری انقلاب پیدا کرنے کے لیے کر رہے تھے۔ تا کہ یہ فکری انقلاب ایک صحیح قسم کے عملی اور سیاسی انقلاب کے لیے محرک کا کام دے۔

مولانا ابوالليث اصلاحی ندویؒ
ترجمہ: ڈاکٹر محمد راشد اصلاحی

مولانا حمید الدین فراہیؒ: حیات وخدمات

(مولانا ابواللیثؒ اصلاحی ندوی (۱۹۱۳ - ۱۹۹۰ء) نے دارالعلوم ندوۃ العلماء میں قیام کے دوران مولانا حمید الدین فراہیؒ کی حیات وافکار پر عربی مجلہ الضیاء الشہریہ لکھنؤ (۴ / ۲ نومبر ۱۹۳۳ء) میں ایک مضمون شائع کیا تھا۔ یہ مضمون مولانا کے انتقال کے ٹھیک تین سال بعد لکھا گیا تھا۔ اس میں مولانا کی شخصیت اور ان کی علمی خدمات کا بڑے دل نشین انداز میں تعارف کرایا گیا ہے۔ اس مضمون کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں مولانا فراہی کی شخصیت اور ان کے علمی مقام ومرتبہ کے بارے میں علامہ تقی الدین ہلالی کے خیالات وتاثرات کو انہی کے الفاظ میں نقل کیا گیا ہے، جو ان کی ذاتی ڈائری سے ماخوذ ہیں۔ اس مضمون کی اہمیت کے پیشِ نظر اس کا ترجمہ ہدیۂ ناظرین کیا جارہا ہے۔ مترجم)

علامہ حمید الدین فراہی ان یگانہ روزگار شخصیت میں شامل تھے جو صدیوں میں منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوتی ہیں۔ آپ ۱۸۶۴ء میں ماہ جمادی الآخرۃ میں اعظم گڑھ کے ایک گاؤں ''فریہا'' میں پیدا ہوئے۔ آپ کا تعلق ایک اعلیٰ خاندان سے تھا۔ آپ کے والدین بھی نہایت شریف النفس تھے اور انہیں کے زیر سایہ آپ پروان چڑھے۔ دس سال ہی کے تھے تو قرآن مجید حفظ کرلیا۔ اور اس کے بعد اس وقت کے دستور کے مطابق فارسی زبان وادب کی تحصیل کی طرف متوجہ ہوئے اور

اس فن کے جانے مانے استاد مہدی حسن صاحب (چتارہ، اعظم گڑھ) کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا اور صرف چھ ماہ کی قلیل مدت میں انہوں نے اس میدان میں اتنی استعداد پیدا کر لی کہ فارسی میں شاعری کرنے لگے اور جولانیٔ طبع کا عالم یہ تھا کہ بہت سے مشہور شعراء کو بھی پیچھے چھوڑ دیا۔ چنانچہ سولہ سال کی عمر میں انہوں نے فارسی کے عظیم شاعر خاقانی کے طرز پر ایک قصیدہ لکھا جس کا معیار زبان و بیان اور فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے نہایت بلند تھا۔ ماہرین زبان و ادب نے اسے بہت پسند کیا۔ علامہ شبلی نے اس قصیدہ کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا اور اسے فارسی اور عربی کے مشہور ادیب مولانا محمد فاروق صاحب چریاکوٹی کے پاس لے گئے اور انہیں سنانے کے بعد پوچھا کہ یہ کس کا قصیدہ ہے۔ انہوں نے کہا کہ میں یہ تو نہیں جانتا کہ یہ قصیدہ کس کا ہے البتہ مجھے متقدمین شعراء میں سے کسی کا معلوم ہوتا ہے۔ آپ کا فارسی میں ایک دیوان بھی ہے جو آپ کے بھائی رشید الدین فراہیؒ، ناظم مدرسۃ الاصلاح کی زیر نگرانی بڑے اہتمام سے منظر عام پر آیا ہے۔
فارسی زبان کی تکمیل کے بعد انہوں نے عربی زبان و ادب کی طرف توجہ کی اور اس وقت ان کی عمر ۱۴ سال تھی۔ درس نظامی کی متوسط کتابیں انہوں نے اپنے پھوپھی زاد بھائی علامہ شبلی نعمانی سے پڑھیں جو عمر میں آپ سے چھ سال بڑے تھے، پھر کچھ دنوں لکھنؤ میں مشہور فقیہہ مولانا ابوالحسنات عبدالحی کے پاس رہ کر ان سے استفادہ کیا۔ اس کے بعد تشنگیٔ علم انہیں مشہور و معروف ادیب مولانا فیض الحسن سہارنپوری کے پاس لے گئی جو عربی زبان و ادب پر غیر معمولی دسترس کے لیے مشہور تھے اور مختلف مقامات سے طلبہ حصول علم کے لیے ان کے پاس آتے تھے۔ چنانچہ مولانا فراہی نے کچھ دنوں ان سے استفادہ کیا اور اپنے علم کی پیاس بجھائی۔ انہیں علمی صحبتوں کا نتیجہ تھا کہ وہ علوم و فنون کی دنیا میں ایسے بلند مقام پر فائز ہو گئے جہاں تک علماء ہند میں سے کم ہی کسی کی رسائی ہوئی ہو۔ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ علوم و فنون کے میدان میں وہ اپنے اساتذہ کرام سے بھی آگے نکل گئے۔ علامہ شبلیؒ نے مجلہ ''الندوہ'' دسمبر ۱۹۰۵ میں آپ کی تصنیف جمہرۃ البلاغہ پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ ''ان کی کوئی مثال نہیں۔ ادب میں ان کی نظیر نہیں۔'' اس بلند مرتبہ پر فائز ہونے کے باوجود انہوں نے اسی پر قناعت نہیں کی بلکہ انگریزی زبان کو سیکھنے کی طرف توجہ کی اگرچہ اس زمانے میں انگریزی زبان کا پڑھنا مسلمانوں کے نزدیک معیوب سمجھا جاتا تھا۔

اس وقت ان کی عمر بیس سال تھی۔ ۱۸۹۲ء میں انہوں نے الہ آباد یونیورسٹی سے بی۔اے کی ڈگری حاصل کی اور علوم عربیہ کے حصول کے بعد علوم جدیدہ سے بہرہ ور ہوئے۔ گو اب ہندوستان میں یہ کوئی عجیب بات نہیں رہی اور بہت سے لوگ یہی طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ لیکن اس سلسلہ میں ایک بنیادی فرق یہ ملحوظ رہے کہ اکثر و بیشتر لوگ جب جدید تعلیم کے حصول کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو اپنے پچھلے اکتسابات کو یکسر فراموش کر دیتے ہیں لیکن علامہ حمید الدین فراہیؒ نے اپنی پچھلی تعلیمات کو سینے سے لگائے رکھا۔ تفصیلات میں جانے کا موقع نہیں لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ جدید علوم حاصل کرنے والے ایک بڑے طبقے کی عادتیں بدل گئیں اور وہ اسلامی علوم وثقافت کو حقیر گردانںے لگے اور اپنے سلف صالحین کو کم تر و بے وقعت سمجھنے لگے اور ان کی تہذیب، رسم و رواج اور کوشش کو ناپسند کرنے لگے۔ اس کے برخلاف انہیں علوم نے مولانا فراہیؒ کو دینی معاملات میں بہت سخت اور ان امور میں متشدد بنا دیا جن میں عقل اور دین کی رو سے تشدد ہی بہتر ہے۔ چنانچہ وہ تقویٰ، زہد، علم وفضل اور ان اخلاق حسنہ کے جامع تھے جن سے سلف صالحین متصف تھے۔ عقائد کے باب میں حریتِ فکر، علوم عصریہ کا گہرا مطالعہ، حالات حاضرہ کی مکمل خبر اور مقتضیات زمانہ سے حقیقی واقفیت ایسی خصوصیات ہیں جن میں اپنی مثال وہ آپ تھے۔ علاوہ ازیں وہ اور بھی بہت سے ایسی خوبیوں سے متصف تھے جو اس زمانہ کے روشن خیال علماء کے لیے باعث فخر ہیں۔ اہل مشرق اور اہل مغرب کی اچھی صفات کے اپنانے اور دینی اور انگریزی علوم کے حصول کے باعث ان کی حیثیت ایک ایسے مجمع البحرین کی ہوئی جہاں دو سمندر آپس میں ملتے ہیں لیکن ان کے درمیان ایک دیوار حائل رہتی ہے اور وہ اپنے حدود سے تجاوز نہیں کرتے۔ یا یوں کہئے کہ ایک ہی افق پر دو چاند نور افگن ہیں اور ساری دنیا کو اپنی ضیا پاشیوں سے منور کر رہے ہیں۔

زمانۂ تعلیم کے بعض علمی کام

عربی زبان وادب سے فراغت کے بعد مولانا فراہی علی گڑھ تشریف لے گئے۔ ان دنوں کالج کے ہر طالب علم کے لیے عربی وفارسی کی تعلیم لازمی تھی لیکن مولانا کو اس کلیہ سے مستثنیٰ قرار دیا گیا۔ اس باب میں سرسید احمد خاں نے کالج کے پرنسپل کو یہ لکھا کہ ان دونوں زبانوں میں

مولانا فراہی کی لیاقت اساتذہ سے کم نہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ سرسید احمد خاں ان دونوں میں ان کی اہلیت اور لیاقت کے قائل تھے۔ چنانچہ انہوں نے اسی دوران مولانا فراہیؒ سے علامہ شبلی کی کتاب ''تاریخ بدء الاسلام'' اور ''طبقات ابن سعد'' کے ایک جزو کو، جو اس وقت تک چھپی نہیں تھی، کالج کے طلبہ کے لیے فارسی میں منتقل کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ ترجمہ اتنا معیاری تھا کہ دونوں کتابیں طباعت کے بعد داخل نصاب کر دی گئیں۔ مذکورہ باتوں سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ انہیں ان دونوں زبانوں پر کس قدر قدرت حاصل تھی۔

ملازمتیں

مختلف تعلیمی مراحل طے کرنے کے بعد وہ متعدد مناصب پر فائز ہوئے۔ سب سے پہلے ۱۸۹۷ء میں وہ مدرسۃ الاسلام کراچی میں منصبِ تدریس پر فائز ہوئے اور ۱۹۰۶ء تک وہاں تدریسی فرائض کی انجام دہی کے ساتھ تصنیفی سلسلہ بھی جاری رہا۔ اس کے بعد ان کا تقرر علی گڑھ کالج میں عربی کے استاد کی حیثیت سے ہوا اور یہاں اپنے قیام کے دوران جو ۱۹۰۸ء تک رہا، فرائض منصبی کے ساتھ ساتھ تصنیفی مشاغل بھی برابر چلتے رہے۔ اس کے بعد آپ الٰہ آباد یونیورسٹی میں پروفیسر ہو گئے اور ۱۹۱۴ء میں وہیں سے حیدر آباد چلے گئے جہاں انہیں ''مدرسۃ دار العلوم العربیہ الامیریہ'' کا ذمہ دار متعین کیا گیا۔ وہاں آپ کا قیام ۱۹۱۹ء تک رہا۔ اس دوران آپ نے مدرسہ کے حالات و معاملات اور نصاب کے سلسلے میں مفید اور دور رس اصلاحات کیں، وہیں پر آپ نے اپنی تفسیر کے بعض اجزاء کی بھی تالیف کی لیکن جب انہیں یہ احساس ہوا کہ مدرسہ کی ذمہ داریاں قرآن کے مطالعے میں مانع ہو رہی ہیں اور قرآن کے اسرار و رموز پر غور وفکر کے لیے انہیں خاطر خواہ یکسوئی نہیں مل پا رہی ہے تو انہوں نے ترک ملازمت کا فیصلہ کر لیا اور ہر چیز سے منہ موڑ کر خود کو صرف قرآن کے لیے یکسو کر لیا۔ امراء اور اعیان سلطنت اور ان کے دوسرے قدر دانوں نے انہیں اس ارادے سے باز رکھنے کی بہت کوشش کی لیکن ان کی کوششیں بار آور نہ ہوئیں اور وہ وہاں مزید وقت دینے کے لیے کسی طرح تیار نہ ہوئے۔ کیونکہ اس سے کہیں زیادہ اہم کام ان کے پیش نظر تھا جو علامہ شبلی کے ذہن میں ایک مدت سے جاگزیں تھا۔

علامہ شبلی کا منصوبہ یہ تھا کہ مولانا فراہی دارالمصنفین اور مدرسۃ الاصلاح کی زمام کار اپنے ہاتھ میں لے لیں۔ چنانچہ اس سلسلے میں علامہ شبلی نے انہیں ایک خط اس وقت لکھا تھا جب وہ الہٰ آباد یونیورسٹی میں پروفیسر تھے جس میں انہیں مدرسۃ الاصلاح آنے کی دعوت دی گئی تھی تاکہ دونوں مل کر اس کا نظم ونسق سنبھال لیں۔ اپنی زندگی کے آخری ایام میں انہیں حیدرآباد ایک خط لکھا۔ اس خط میں اپنی گوناگوں بیماریوں کا تذکرہ کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ ''دارالمصنفین اگر میں نے قائم کر دیا تو تمہارے علاوہ اس کا انتظام وانصرام کون چلا سکتا ہے۔ چنانچہ وطن واپسی کے بعد استاذ امام نے ہر چیز سے منہ موڑ کر اپنی ساری توجہ دارالمصنفین پر مرکوز کی۔ وہ اس کی مجلس انتظامیہ کے صدر اور اس کے بانیوں میں تھے اور یہاں آنے کے بعد تصنیف وتالیف کا باقاعدہ سلسلہ شروع ہو گیا۔ نیز قرآن پر غور وخوض میں انہماک بڑھ گیا۔ علاوہ ازیں جو طلبہ آپ کے پاس آتے انہیں درس قرآن دیتے۔ یہ زندگی کے آخری ایام میں انہوں نے جو علمی خدمات انجام دیں ہیں اس کے بہترین نتائج سامنے آئے جن سے اہل علم بخوبی واقف ہیں۔ چنانچہ ان غیر معمولی خدمات کا ذکر کرنے سے قبل مناسب ہو گا کہ ان کے اخلاق وعادات اور وضع قطع پر کچھ روشنی ڈالی جائے۔

وضع قطع اور اخلاق

علامہ تقی الدین ہلالی کے بقول: وہ گندمی رنگ کے نہایت وجیہہ اور بلند قامت انسان تھے۔ داڑھی گول، لمبی اور بالکل سفید تھی۔ وہ گوشۂ نشین اور خلوت پسند تھے۔ ان کے اندر سطحیت اور ریاکاری کا کوئی شائبہ تک نہ تھا، ہر ایک سے تواضع اور خاک ساری سے ملتے، زہد وصفات کاملہ اور اخلاق فاضلہ میں اپنی مثال آپ تھے۔ زیادہ تر خاموش رہتے لیکن بات کرتے تو پر لطف ہوتی۔ بڑے عبادت گزار، گوشہ نشین اور لذات دنیا سے بہت دور تھے۔ شب بیداری ان کا معمول تھا، راتوں کو اٹھ کر تہجد پڑھتے اور قرآن کی تلاوت کرتے، نماز پڑھتے وقت آنکھیں اشک بار ہوتیں۔ نماز اس طرح پڑھتے گویا اللہ تعالیٰ انہیں دیکھ رہا ہے۔ وہ علماء متقدمین کے اخلاق کے پرتو تھے اور ان کے اندر اولیاء اللہ کی صفات نمایاں تھیں۔ انہیں دیکھ کر علماء متقدمین کے فضل وکمال کا اندازہ کیا جا سکتا تھا اور ان کے اندر اولیاء اللہ کی خوشبو محسوس کی جا سکتی تھی، اگرچہ انہوں نے

انگریزی اور علوم جدیدہ سے بہت کچھ استفادہ کیا تھا۔ زیادہ تر اپنے کام خود کرتے ،صرف مجبوری کی حالت میں کسی کو زحمت دیتے۔ان کی چھوٹی یا بڑی کوئی ضرورت کوئی انجام دینا چاہتا تو اسے بڑی خوش اسلوبی سے منع کر دیتے ،ان کی شخصیت میں ایک عجیب جاذبیت تھی جو خال خال ہی کسی میں نظر آتی ہے۔ فراخی اور خوش حالی کے باوجود رہن سہن ،لباس اور غذا وغیرہ کے معاملہ میں بالکل سادہ مزاج تھے۔اپنے علم وفضل کے خزانے پر انہیں ذرہ برابر کبر وغرور نہ تھا جیسے وہ اس سے واقف ہی نہ ہوں۔انہوں نے کبھی کسی کو یہ احساس نہیں ہونے دیا کہ وہ صاحب ثروت یا بہت بڑے عالم ہیں۔ایک عام آدمی ان کو دیکھ کر ان کی اہمیت کا اندازہ نہیں کر پاتا۔صرف ان سے تعلق رکھنے والا ہی انہیں ایک عالم کی حیثیت سے جانتا تھا۔ چنانچہ ایک بار مجھے بھی ایسا ہی دھوکہ ہوا۔جب میں بغرض تعلیم مدرسۃ الاصلاح گیا اور درجہ عربی اول میں داخلہ لیا تو دیگر اساتذہ کے ساتھ وہاں انہیں بھی دیکھا۔وہ بالعموم مدرسہ پر ہفتہ میں تین دن قیام فرماتے تھے۔ میں ان کی اصلی حیثیت کا ادراک نہ کر سکا اور اساتذہ کے درمیان اٹھتے بیٹھتے دیکھ کر انہیں بھی ایک عام استاذ سمجھا۔اصل حقیقت کا اندازہ تو مجھے کچھ دنوں بعد ہوا تب ان کے بلند مقام اور عالی مرتبہ کا احساس ہوا۔وہ قناعت پسند، جاہ ومنصب سے بے پروا اور قیادت وسیاست سے کوسوں دور تھے۔ان کے مزاج میں استغناء تھا حالانکہ انہیں ایسے مواقع ملے تھے جن سے وہ شہرت وعزت کی چوٹی تک پہنچ سکتے تھے اور بہت سے دنیوی فوائد بآسانی حاصل کر سکتے تھے۔لیکن انہیں ان چیزوں سے کبھی کوئی دلچسپی نہ ہوئی۔ چنانچہ جب ہندوستان کے وائسرائے لارڈ کرزن نے حکومت برطانیہ اور عرب شیوخ کے درمیان اختلافات کو ختم کرانے کے لیے سواحل عرب اور خلیج فارس کا دورہ کیا تو اس سفر میں بحیثیت ترجمان مولانا کا انتخاب ہوا۔عرب شیوخ کے سامنے عربی میں جو خطبہ پڑھا گیا اسے مولانا ہی نے تیار کیا تھا۔اگر انہیں شہرت وعزت یا کسی اہم سرکاری منصب کی خواہش ہوتی تو اسے وائسرائے کے ذریعے بآسانی حاصل کر سکتے تھے۔لیکن ان کے دل میں اس طرح کا کوئی خیال نہیں آیا۔انہوں نے اپنے اس سفر سے متعلق کچھ اشعار کہے تھے جسے مولانا سید سلیمان ندوی نے ان کی وفات کے بعد مجلہ ''معارف'' میں شائع کیا تھا۔ان اشعار سے واضح ہے کہ وہ مال و دولت اور شہرت وعزت کی خواہش سے ہمیشہ دور رہے۔اشعار درج ذیل ہیں:

نادان در جستجوئے کام افتادہ است | دانا در جستجوئے نام افتادہ است
بگریز فراہیا! ازیں ہر دو کہ زود | بینی کہ گلوئے شان بدام افتادہ است

نادان تلاش رزق میں سرگرداں ہے اور دانا نام و شہرت کی جستجو میں، فراہی! ان دونوں ہی سے بچو کیونکہ جلد ہی نظر آئے گا کہ دونوں کی گردنیں زیرِ دام ہیں۔

گویند کہ گمنام بدن از خامی است | آوارۂ و نام جو کہ خوش فراحامی است
در پیش فراہی اے نکو اندیشاں | ایں جستن نام بدترین بد نامی است

کہتے ہیں کہ گم نامی بہت بڑی کمی ہے۔ نام و نمود کی جستجو کرو کہ یہی دلیل خوش بختی ہے۔ لیکن اے نیک اندیش لوگو! فراہی کے نزدیک نام و نمود کی طلب ہی بدترین بدنامی کی چیز ہے۔

خاک ہے گر جہاں میں کچھ ہے | وہم ہے گر گماں میں کچھ ہے
تجھ پر کیا اعتبار ہے ہستی | آن میں کچھ ہے آن میں کچھ ہے

مندرجہ بالا اشعار اس بات پر شاہد ہیں کہ نام و نمود اور جاہ و منصب سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں تھی چاہے اسے کتنی ہی آسانی سے حاصل کیا جا سکتا ہو۔ گو اس طرح کے واقعات بہت ہیں لیکن ان کے مزاج کو سمجھنے کے لیے یہی ایک واقعہ کافی ہے۔ مولانا کی شخصیت کا اندازہ کسی قدر اس واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ ایک ہزار مشاہرہ کے منصب جلیل سے بلا کسی سبب مستعفی ہو گئے جس کی بڑے بڑے لوگ تمنا کرتے ہیں۔ ایسا صرف اس وجہ سے کر سکے کہ وہ تھوڑے پر قناعت کے خوگر تھے اور زیادہ کی ہوس نہیں کرتے تھے۔ انہوں نے ہمیشہ عزلت اور گوشہ نشینی کو ترجیح دی لیکن کہیں سورج کو دن میں بھی چھپایا جا سکتا ہے۔ چنانچہ ہندوستان کے اہل علم اور وہ حضرات جن کو ان کی کتابوں اور ان کی تفسیر نظام القرآن کا بغور مطالعہ کرنے کا موقع ملا ہے یا جنہیں ان سے شرف ملاقات حاصل ہوا ہے سب کا اس بات پر اتفاق ہے کہ مولانا حمید الدین فراہی مختلف علوم خصوصاً علوم قرآن میں یگانہ روزگار تھے۔ کوئی ان کی گرد کو بھی نہ پا سکا۔ اسی طرح ان کے علم و فضل کی شہرت دور دراز ممالک۔ مثلاً مصر، شام، حجاز نیز دوسرے اسلامی ممالک میں پھیل گئی۔ چنانچہ مشہور مجلہ ''المنار'' کے بانی سید رشید رضا مصری نے ان کی کتابوں پر ایک تبصرہ لکھا جس میں ان کی کتابوں اور ان کی شخصیت کی تعریف و اعتراف میں رطب اللسان ہیں۔ اسی طرح

دار العلوم ندوۃ العلماء میں عربی ادب کے استاذ علامہ تقی الدین ہلالی صاحب ۱۳۴۲ھ میں ہندوستان آئے تو انہوں نے مولانا فراہی سے ملاقات کے لیے ان کے گاؤں کا سفر کیا۔ اس کے علاوہ شام، مصر، حجاز کے دوسرے بہت سے جلیل القدر علماء نے بھی ان سے ملاقاتیں کیں۔ ایک دفعہ میں اپنے استاذ علامہ تقی الدین ہلالی کی ڈائری کے صفحات الٹ پلٹ رہا تھا جس میں انہوں نے اپنے سفر ہندوستان کی روداد قلم بند کی تھی۔ ایک جگہ میری نظر علامہ فراہی کی تحریر پر پڑی جسے میں نے فوراً پہچان لیا۔ اس میں انہوں نے بہت اختصار سے اپنی تاریخ ولادت، تعلیم کی ابتدا اور مختلف عہدوں پر تقرر کا ذکر کیا تھا۔ اسے اس مضمون کے آخر میں بعینہٖ نقل کروں گا۔ اسی ڈائری میں ایک دوسری جگہ علامہ نے مولانا کے عادات واطوار کے بارے میں اپنے تاثرات قلم بند کیے ہیں جسے میں نے تمام وکمال نقل کر دیا ہے۔

مولانا فراہی کا ایک دیوان بھی ہے۔ مجھے خود ان سے اس کے اشعار سننے کی سعادت حاصل ہوئی ہے۔ ان کے اشعار بہت بلیغ اور اثر آفریں ہیں جو مسلمانوں کے پژمردہ دلوں میں زندگی کی روح پھونکنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اس میں اسلام اور مسلمانوں کے دشمنوں، جنگ طرابلس اور جنگ عظیم کا پرسوز انداز میں ذکر کیا گیا ہے۔ ان کی گفتگو کی فصاحت کا یہ عالم تھا کہ علماء ہند تو کیا علماء عرب بھی ان کے سامنے ماند پڑ جائیں۔ ان کی عمر لگ بھگ ۷۰ سال تھی جب انہوں نے مدرسۃ الاصلاح کی بنیاد رکھی جس میں قرآن کی تعلیم کو بنیادی اہمیت حاصل ہے جو دراصل مسلمانوں کی متاع گمشدہ ہے۔ قرآن کی تفسیر سے متعلق مجھے ان سے ایک تقریر سننے کا موقع ملا جس کی فصاحت وبلاغت اور اثر انگیزی سے میری آنکھیں بھر آئیں۔ وہ مسئلہ خلافت سے بخوبی واقف تھے۔ اہل ہند کے برخلاف خلافت سے متعلق ان کے یہاں کوئی ابہام نہیں پایا جاتا۔ عقائد اور دوسرے شرعی معاملات میں وہ کسی خاص مسلک کے پیرو نہ تھے بلکہ اس بارے میں خود اجتہاد کرتے تھے۔ البتہ عبادات میں حنفی مسلک کی پیروی کرتے تھے اور ایسا غالباً اس لیے تھا کہ اسی ماحول میں ان کی نشو ونما ہوئی تھی۔ معاملات میں وہ حنفی مسلک کو آسان تصور کرتے تھے۔ انگریزی، عربی، فارسی اور اردو چاروں زبانوں کے ماہر تھے۔ مختلف سرکاری عہدوں پر فائز رہے۔ علی گڑھ میں بھی ایک ممتاز استاذ کی حیثیت سے کام کیا اور آج ۱۷ر رمضان ۱۳۴۲ھ تک میری

جن علماء سے ملاقات ہوئی وہ ان سب پر فوقیت رکھتے تھے۔

علمی خدمات

علامہ فراہیؒ کی علمی خدمات اتنی زیادہ ہیں کہ ان کا احاطہ کرنا مشکل ہے۔اس کی بھرپور توضیح وتشریح کے لیے ایک ادارہ کی ضرورت ہے۔تاہم یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ان کی جدید طرز اور منفرد اسلوب کی تفسیر قرآن پر کسی قدر روشنی ڈالی جائے جس سے صرف نظر کرنا ممکن نہیں ۔انہوں نے اس کام میں اپنی عمر کا ایک بڑا حصہ لگ بھگ تیس سال کا عرصہ مطالعہ قرآن کے لیے وقف کر دیا جس کے نتیجہ میں قرآن کی حکمتوں اور اسرار ورموز تک ان کی رسائی ہوئی۔ ان کی یہ عظیم خدمات نہ صرف ہندوستان بلکہ پوری امت مسلمہ کے لیے سرمایہ افتخار ہیں۔ علامہؒ کا خیال تھا کہ قرآن کی تفسیر خود قرآن سے کی جائے اس لیے کہ اس کا ایک حصہ دوسرے حصے کی تشریح کرتا ہے۔اکثر مفسرین کے برعکس ان کا یہ نظریہ تھا کہ قرآن کی تمام آیات منظم اور پورا قرآن باہم مربوط ہے۔علامہ کے خیال کے مطابق اگر کسی آیت یا سورہ کو اس کی اصلی جگہ سے ہٹا دیا جائے تو نظم قرآن درہم برہم ہو جائے گا۔کلام کا سارا حسن ، بلاغت اور حکمت جاتی رہے گی۔ اپنے ان خیالات کی تائید میں انہوں نے ٹھوس اور مضبوط دلائل بھی پیش کیے ہیں۔ نیز اپنے ہی اصولوں کی روشنی میں تفسیر نظام القرآن ،تالیف کی جو ہنوز طبع نہیں ہوسکی ہے نظم قرآن کے اثبات کے لیے انہوں نے جو دلیلیں دی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ اگر آیتوں اور سورتوں میں کوئی خاص نظم نہ ہوتا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم یہ حکم کیوں دیتے کہ فلاں آیت کو فلاں سورہ میں رکھا جائے۔ اور اس کا مطلب کیا ہوتا۔صحیح روایات سے یہ ثابت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر بیک وقت متعدد سورتیں نازل ہوتی تھیں اور جب آپ پر کوئی آیت یا چند آیات نازل ہوتیں تو آپؐ کاتبین وحی میں سے کسی کو بلا کر فرماتے کہ ان آیتوں کو فلاں سورہ میں رکھو جس میں یہ یہ باتیں بیان ہوئی ہیں۔ خلاصۂ کلام یہ کہ استاذ امام، فہم قرآن اور اس کی مشکلات کی عقدہ کشائی کے سلسلے میں اللہ کی آیتوں میں سے ایک آیت تھے۔ان کی تفسیر نظام القرآن کے کچھ اجزاء کی اشاعت ہو چکی ہے۔لیکن بیشتر حصے ابھی غیر مطبوعہ ہیں۔ان کی ایک گراں قدر تصنیف ”الرأی الصحیح فی من ھو الذبیح“ ہے۔

اس میں مولاناؒ نے تورات اور قرآن سے استدلال کرتے ہوئے یہ ثابت کیا ہے کہ ذبیح اللہ اسماعیل علیہ السلام ہیں۔ اس طرح یہود نے تورات میں جو تحریفات کی ہیں ان کی پردہ کشائی کی ہے۔ اس اہم مسئلہ کی تحقیق انہوں نے علامہ شبلی نعمانی کے لیے کی تھی جب وہ اپنی شہرۂ آفاق کتاب ''سیرۃ النبیؐ'' تصنیف کرر ہے تھے۔ استاذ امام نے اس ضرورت کے پوری ہو جانے کے بعد مزید غور و خوض کیا اور کچھ اضافے کے بعد کتابی شکل میں شائع کیا، انہی تصنیفات میں ''امعان فی اقسام القرآن'' بھی شامل ہے جس میں مولانا نے قرآن مجید میں استعمال ہوئے کلمات قسم سے بحث کی ہے۔ اس تحقیق سے ان تمام شکوک وشبہات کا مکمل طور پر ازالہ ہوتا ہے جو آیات قسم کی تلاوت کے دوران ذہن میں خلجان کے باعث ہوتے ہیں۔ اگرچہ ان سے پہلے بھی یہ موضوع زیر بحث آچکا ہے اور امام رازیؒ نے اپنی تفسیر میں اس کے معنی ومفہوم کی پردہ کشائی کی کوشش کی۔ امام ابن القیمؒ نے خاص اسی موضوع پر ایک کتاب ''التبیان فی اقسام القرآن'' بھی تصنیف کی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جس نے ''الامعان'' کا بہ غور مطالعہ کیا ہے اور امام رازیؒ اور ابن القیمؒ کی تحقیقات سے بھی رجوع کیا ہے وہ اس بات کی گواہی دے گا کہ علوم قرآن اور احکام شریعت کے یہ دونوں ماہرین اس باب میں خود ہی ایسی الجھنوں کے شکار ہو گئے جن سے گلوخلاصی ممکن نہ ہوسکی۔ مولانا فراہی نے اقسام القرآن کے سلسلے میں پیش آنے والی مشکلات کو اس طرح حل کر دیا کہ صورت حال بالکل واضح ہو کر سامنے آگئی۔ میرے اس بیان پر جسے بھی کچھ شبہ ہو اسے اس کتاب کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ ان کی اہم ترین کتابوں میں ایک کتاب ''جمھرۃ البلاغۃ'' ہے جس میں قرآنی بلاغت اور نظم آیات کے موضوع پر بحث کی گئی ہے۔ نیز ارسطو کے نظریۂ بلاغت پر تنقید کی گئی ہے۔ علامہ شبلی نعمانی نے مجلہ ''الندوہ'' دسمبر ۱۹۰۵ء میں اس پر تقریظ لکھی جس میں اس کی بہت کچھ توصیف کی اور کہا کہ مسلمانوں کے لیے اس کتاب کی وہی اہمیت ہے جو پیاسے کے لیے آب زلال کی ہوتی ہے۔

ان کا ایک کارنامہ مدرستہ الاصلاح ہے۔ یہ ایک عربی دینی درس گاہ ہے جو اپنی کچھ مخصوص خوبیوں کی وجہ سے ہندوستان کے دیگر دینی مدارس سے ممتاز ہے۔ مولانا آخر دم تک اس کے ناظم رہے۔ وہ ہفتہ میں تین شب و روز مدرسہ پر قیام کرتے۔ اساتذہ اور منتہی طالب علموں کو

درس قرآن دیتے۔ عربی درسیات کی نگرانی کرتے اور مدارس میں رائج نصاب پر برابر غور وفکر کرتے رہتے تھے۔ ان کی نظر میں یہ نصاب از کار رفتہ اور غیر سودمند تھا۔ انہوں نے اس میں مفید اصلاحات کیں اور غیر مفید علوم کو نکال کر اسے مختصر کیا۔ اس طرح اس مدرسہ کا نہایت عمدہ نصاب تعلیم تیار ہو گیا۔ میری خواہش تھی کہ اس نصاب سے متعلق مولانا کے ان خیالات کو جن کا انعکاس اس نصاب میں پایا جاتا ہے نیز اس مدرسہ اور اس کے اساتذہ کی بعض خصوصیات اور اپنے بعض اہم اساتذہ کا ذکر اس مضمون میں کروں لیکن رسالہ کی تنگ دامانی اس کی اجازت نہیں دے رہی ہے۔ انشاء اللہ بعد میں اس کا مفصل ذکر کیا جائے گا اور اس مضمون کو میں انہی کی اس تحریر پر ختم کر رہا ہوں جس کا حوالہ پہلے دیا جا چکا ہے۔ مولانا فراہیؒ لکھتے ہیں کہ ”میں جمادی الثانی ١٢٨٠ھ کو اعظم گڑھ کے ایک گاؤں فریہا میں پیدا ہوا اور لگ بھگ دس سال کی عمر میں قرآن مجید حفظ کر لیا۔ اور نو مہینے کی مدت میں فارسی زبان سیکھ لی۔ لیکن مختلف بیماریوں کے باعث اس دوران میں لکھنے پڑھنے کا کام دو سال تک رکا رہا۔ پھر چودہ سال کی عمر میں عربی تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا۔ درس نظامی کی اکثر کتابیں میں نے اپنے پھوپھی زاد بھائی علامہ شبلیؒ سے پڑھیں۔ پھر ہندوستان کے بعض مشاہیر اہل علم جیسے لکھنؤ میں مولانا عبدالحی فرنگی محلی اور لاہور میں مولانا فیض الحسن سہارنپوری سے شرف تلمذ حاصل کیا۔ پھر خرابیٔ صحت کے باعث ایک سال تک تعلیم کا سلسلہ منقطع رہا۔ اس کے بعد انگریزی اور علوم جدیدہ کی تعلیم کی طرف توجہ کی۔ پھر وکالت کے پیشہ سے نفرت کے باوجود دو سال تک موجودہ قوانین کی تعلیم حاصل کی لیکن پھر اسے چھوڑ دیا۔ بالآخر میں نے اپنے لیے معلمی کا پیشہ پسند کیا اور مختلف مدارس میں تدریسی خدمات انجام دیں۔ چنانچہ علی گڑھ کالج اور الٰہ آباد یونیورسٹی میں پروفیسر رہا اور دارالعلوم حیدرآباد میں پرنسپل کے فرائض انجام دیے۔ چوں کہ قرآن کے علاوہ مجھے کسی اور کتاب سے دلچسپی نہیں سوائے متون حدیث اور ان چیزوں کے جو فہم قرآن میں مددگار ہوں اور چونکہ یہ مشاغل مطالعۂ قرآن میں حارج ہوتے تھے اس لیے میں نے ملازمت کو خیرآباد کہا اور اپنے وطن لوٹ آیا۔ اس وقت میری عمر پچاس اور ساٹھ کے درمیان تھی۔ افسوس کہ عمر کے بیشتر حصے ایسی مصروفیات میں ضائع ہوئے جن کا نقصان فائدے سے کہیں زیادہ ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ایمان پر خاتمہ کی توفیق دے۔ آمین

ڈاکٹر عرفات ظفر اصلاحی

علّامہ حمید الدین فراہیؒ اور تقویٰ

مولانا حمید الدین فراہی علیہ الرحمہ (۱۸۶۳-۱۹۳۰) ایک عظیم مفسر، بلند پایہ محقق اور علوم قدیمہ وجدیدہ کے ماہر کی حیثیت سے معروف ومشہور ہیں۔ان کے نام سے ذہن میں ایک ایسے قلندرانہ صفت عالم ومفسر کا تصور ابھرتا ہے جس نے اپنی پوری زندگی تفکر وتدبر قرآن کے غار میں معتکف رہ کر بسر کردی، اور کتاب اللہ کے اسرار ومعارف کی تلاش وجستجو کو اپنا سرمایۂ حیات بنالیا۔

مولانا فراہیؒ نے تمام علوم وفنون کا قرآن کی روشنی میں جائزہ لیا اور ان کی تدوین جدید کا بیڑہ اٹھایا۔ چنانچہ اس سلسلے میں مختلف موضوعات پر متعدد گراں قدر کتابیں تصنیف کیں۔علاوہ ازیں درس وتدریس اور انتظام وانصرام جیسے اہم امور میں بھی اپنے روشن نقوش ثبت کیے۔

مولانا کی انھیں مختلف النوع مصروفیات وخدمات کا پہلو کچھ اتنا نمایاں ہوکر سامنے آ گیا کہ ان کی زندگی کا وہ اصل روشن پہلو نگاہوں سے اوجھل ہوگیا۔ جو درحقیقت مولانا کے جملہ اوصاف وکمالات کا سرچشمہ اور ان کی زندگی کی سب سے بیش قیمت متاع ہے۔'یعنی خشیت الٰہی، انابت الی اللہ، تقویٰ، خلوص وللّٰہیت، شب بیداری وآہِ سحر گاہی، کتاب وسنت سے عملی وجذباتی وابستگی۔ جسے ہم بجاطور پر مولانا کی زندگی کا طرہ امتیاز کہہ سکتے ہیں۔مگر مولانا کی زندگی کے اس سب سے زیادہ لائق التفات پہلو سے لوگوں کو بہت کم ہی واقفیت ہے۔ذیل میں ہم نے اسی پہلو کو اجاگر کرنے کی اپنی جیسی ایک کوشش کی ہے۔

مولانا کی ولادت ایک دین دار اور شریف گھرانے میں ہوئی تھی۔آپ ابتدا ہی سے

نہایت شریف وصالح تھے۔ذہن نہایت صاف اور سلجھا ہوا تھا۔والدین کے نہایت فرماں بردار اور صدق وصبر کے خوگر تھے۔مولاناؒ کا خود اپنا بیان ہے:

> ''جن مواقع پر لوگ جھوٹ بول دینے میں کوئی حرج نہیں سمجھتے میں ان مواقع پر بھی ہمیشہ سچ ہی بولنے کی کوشش کرتا تھا،اور میرا ابتدا سے تجربہ ہے کہ سچ بولنے والا کبھی خسارہ میں نہیں رہتا ہے۔''(۱)

اس ضمن میں مولانا نے اپنا ایک دلچسپ واقعہ بھی نقل کیا ہے۔

جب میں مولانا فیض الحسن سہارنپوری مرحوم سے ادب کی تحصیل کے لیے لاہور روانہ ہونے لگا اور والدہ سے رخصت ہو کر زنان خانہ سے باہر نکلا تو دروازہ پر والد صاحب نے پوچھا کہ تمہاری والدہ نے تم کو کتنے روپے دیے؟ مولانا نے فرمایا کہ والد صاحب کے اس سوال پر میں نے خیال کیا کہ اگر میں نے والد صاحب کو والدہ کی دی ہوئی رقم ٹھیک بتادی تو ممکن ہے کہ والد صاحب جو کچھ دینے والے ہیں اس میں کچھ کمی کر دیں،لیکن مجھے جھوٹ بھی نہیں بولنا تھا،اس وجہ سے میں نے صاف صاف کہہ دیا کہ میں نہیں بتاؤں گا۔مولانا فرماتے تھے کہ والد صاحب میرے اس بے ساختہ جواب سے بہت خوش ہوئے اور نہایت محبت سے فرمایا کہ حمید جھوٹ نہیں بول سکتے اور خوش ہو کر میری توقع سے زیادہ مجھے روپے دیے۔(۲)

مولانا امین احسن اصلاحی نے مولانا کے ابتدائی رجحانات کا اندازہ لگانے کے لیے ایک مرتبہ ان سے سوال کیا کہ'' آپ کو سب سے پہلے اور سب سے زیادہ کس کتاب نے متاثر کیا؟ مولانا نے جواب دیا: قصص الانبیاء نے۔مولاناؒ اپنے بچپن میں یہ کتاب اپنی پھوپھی کو جو ان سے بہت زیادہ محبت کرتی تھیں،سنایا کرتے تھے۔مولانا فرماتے تھے کہ وہ اس کتاب کے واقعات سے بہت زیادہ اثر لیتی تھیں اور اسی طرح مجھ پر بھی انبیائے کرام علیہم السلام کے قصوں کو پڑھ پڑھ کر یہ اثر پڑتا تھا کہ دنیا میں آدمی کو انہیں لوگوں کی طرح خلق خدا سے محبت کرنے والا اور خدا سے ڈرنے والا ہونا چاہیے۔(۳)

دنیا سے بے نیازی

مولانا حمید الدین فراہی فطرتاً نہایت سلیم الطبع،تنہائی پسند اور گوشہ گیر قسم کے انسان تھے۔یہی وجہ ہے کہ کراچی،حیدر آباد اور علی گڑھ جیسے شہروں میں رہ کر بھی ان میں کوئی تغیر نہیں ہوا

بلکہ اکثر حالات میں وہاں کے ماحول سے بیزار ہی رہے۔

مولانا فراہیؒ نے ۱۸۹۷ء میں سلسلۂ تعلیم مکمل کر لینے کے بعد مدرسۃ الاسلام (کراچی) سے بحیثیت پروفیسر عربی زبان، وابستہ ہو گئے، اسی زمانہ میں ہندوستان کے وائسرائے لارڈ کرزن کو سواحل عرب اور خلیج فارس کا ایک سیاسی سفر درپیش تھا۔ اس سفر میں انھیں بحیثیت ترجمان ایک ایسے رفیق سفر کی تلاش ہوئی جو بیک وقت عربی اور انگریزی دونوں زبانوں کا ماہر ہو۔ نظر انتخاب مولانا فراہیؒ پر پڑی۔ مولانا خود تو اپنے زاہدانہ مزاج کی بنا پر اس کے لیے راضی نہ ہوئے، مگر اپنے ماموں زاد بھائی اور استاذ علامہ شبلی نعمانیؒ کے بے حد اصرار پر انھیں مجبوراً آمادہ ہونا پڑا۔

مولانا اس تعلق کی بنیاد پر اگر چاہتے تو بہت سارے دنیوی فوائد اور عزت و مرتبہ حاصل کر سکتے تھے، لیکن انھوں نے اسے نہ صرف اپنے لیے کوئی فخر و عزت کی بات نہ سمجھی، بلکہ زندگی بھر اسے عزیز کے جبر پر سرزد ہو جانے والی اپنی ایک غلطی مان کر متاسف رہے اور اس کا تذکرہ تک بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ (۴)

علی گڑھ کے چند واقعات

۱۹۰۷ء میں شعبۂ عربی علی گڑھ میں اسسٹنٹ پروفیسر کی حیثیت سے مولانا فراہیؒ کا تقرر ہوا۔ اس زمانہ میں مشہور شاعر اور ممتاز نثر نگار مولانا اقبال احمد خان سہیلؒ کا قیام مولاناؒ ہی کے ساتھ تھا۔ سہیل صاحب نے مولانا کے تقویٰ اور خشیت الٰہی سے متعلق عجیب و غریب، عبرت آموز اور چشم دید واقعات نقل کیے ہیں۔ لکھتے ہیں:

> ''ہم لوگ جنھیں مولانا کی ہم وطنی کا فخر حاصل ہے، ان کے سامنے ان کے ورع و تقویٰ اور خشیت الٰہی کا تذکرہ کوئی نئی بات نہ ہوگی، لیکن عام طبائع انسانی سے بالکل علیحدہ عملی دنیا میں جن واقعات کا قصہ سنانا چاہتا ہوں وہ اس قدر عجیب و غریب ہیں کہ جن کے سننے والے یا تو مبالغہ طرازی پر محمول کریں گے یا کوئی اور تعبیر فرمائیں گے اور ان کی صحت کو بہ مشکل ہی باور کر سکیں گے''۔ (۵)

پہلا واقعہ

غالباً ۱۹۰۷ء میں مولاناؒ اپنی ملازمت مدرسۃ الاسلام کراچی سے ترک کرنے کے بعد

علی گڑھ تشریف لائے تھے، میں بھی ہم رکاب تھا، چند مہینوں بعد مولاناؒ نے ایک روز مجھے عربی کتابوں کی جدید مطبوعات کی ایک فہرست دی اور حکم دیا کہ میں ایک ہزار روپے قیمت تک کی کتابیں منتخب کرلوں، چونکہ میں بہت ہی گستاخ تھا اس لیے میں نے مولاناؒ سے وجہ دریافت کی۔اس کے جواب میں ارشاد ہوا کہ بارہ سو روپیوں کی نقد بونس کی رقم کراچی سے آئی ہوئی ہے، روپے بےکار پڑے ہوئے ہیں اس لیے اس کی کتابیں خرید لی جائیں، مزید استفسار پر معلوم ہوا کہ یہ رقم والد بزرگوار اور رشید چچا کے پاس سے ہوکر مولاناؒ کے یہاں آئی ہے اور مولانا نے اس رقم کو خود محفوظ رکھنے میں یہ معصیت سمجھتے تھے کہ خدانخواستہ ذہن میں یہ خیال نہ پیدا ہوجائے کہ کسی غیر متوقع ضرورت پر یہ محفوظ رقم کام دے گی، اور اس طرح خدا کے بجائے چند سکوں کو قاضی الحاجات سمجھ لیا جائے، اس طرح گویا ایک شرک خفی کا اندیشہ تھا۔(۶)

دوسرا واقعہ

ایک روز صبح آٹھ بجے کے قریب ایک صاحب ہمارے یہاں تشریف لائے، ان کے ساتھ ایک مزدور کچھ سامان سر پر اٹھائے تھا۔ حسن اتفاق سے مولاناؒ بھی باہر تھے، ان کے سامان میں ایک پرانا ایرانی قالین بھی تھا جو گو بہت استعمال شدہ تھا مگر تھا نہایت خوش رنگ اور بہترین، فرش کے کام میں آسکتا تھا۔ مولاناؒ سے انھوں نے اس قالین کو خریدنے کے لیے بڑی لجاجت سے التجا کی، اس وقت تک مولانا کو کالج سے مشاہرہ نہیں ملا تھا۔ مولانا نے قالین پسند فرمایا لیکن مجبوری ظاہر کی۔ مولاناؒ نے فرمایا کہ ایرانی قالین تو جتنا ہی مستعمل ہوتا ہے اتنا ہی زیادہ قیمتی ہوتا جاتا ہے، میں اس کے لیے تیار ہوں کہ جو دو چار روپے آپ کے قلی کے بار برداری کے ہوں میں ادا کردوں اور آپ اسے لوگوں کو دکھلا لیں شاید آپ کو اس قالین کی معقول قیمت مل جائے۔ انھوں نے عرض کیا کہ لوگ اس قالین کی قیمت دس روپے بھی نہیں دیتے حالاں کہ میں نے آخری قیمت پندرہ روپے لگا دی تھی اس پر بھی کوئی صاحب تیار نہیں ہوئے۔ اس وقت مولانا نے مجھے پکارا اور استفسار فرمایا کہ تمہارے پاس کچھ ہے؟ میں نے عرض کی تیس روپے گھر سے آئے تھے، جس میں سے دو تین خرچ ہو چکے ہیں بقیہ محفوظ ہے۔ آخر مولانا نے ان سے

فرمایا کہ آپ پچیس روپیوں میں یہ قالین دے دیں اور بقیہ قیمت میرے حق میں معاف کر دیں تو میں خرید لوں۔ مولاناؒ کے اس ارشاد پر غریب کو اس قدر تعجب ہوا کہ مالک صاحب آب دیدہ ہو گئے اور کہنے لگے کہ معافی کس چیز کی دوں؟ آپ تو میری مانگ سے دس اور زیادہ دے رہے ہیں۔ بہر حال مولانا کے ارشاد پر انھوں نے تعمیل ارشاد کی اور اس وقت مولانا نے چھبیس روپے مجھ سے لے کر ایک روپیہ اپنی جیب میں ڈالا اور پچیس ان کے حوالے کیے اور وہ ایک روپیہ بھی اس خیال سے رکھ لیا تھا کہ مولاناؒ کالج تک جانے کا ایک روپیہ کرایا ایک شکرم والے کو دیا کرتے تھے۔ (۷)

تیسرا واقعہ

ایک صاحب بظاہر بہت متقی، پرہیز گار اور شریف زادے تھے، جو ہمیشہ بہت صاف اور پر تکلف کپڑوں میں ملبوس رہتے تھے۔ وہ کچھ فلاکت زدہ ہو گئے تھے اور ایک مہذب گداگر کا پیشہ اختیار کر لیا تھا۔ اکثر غلط واقعات بیان کر کے۔ مثلاً کبھی ماں کے کفن اور کبھی کسی ضرورت کا حیلہ کر کے اپنے شناسا لوگوں سے طالب امداد ہوتے تھے۔ یہ حضرت مولانا کی خدمت میں بھی کبھی کبھار آتے اور اپنا مقصد حل کرنے کے بعد واپس جاتے، ایک روز جب مولانا کالج جانے کی تیاری کر رہے تھے انھوں نے آ کر ایک خط مولاناؒ کے نام کا مجھے دیا کہ میں یہ کسی سے اندر بھجوا دوں۔ میں چونکہ ان بزرگ سے واقف تھا اس لیے میں سمجھ گیا کہ غالباً حسبِ معمول کوئی فرضی قصہ تراشا ہوگا۔ خط بھیجنا کوئی ضروری کام نہ تھا اس لیے میں نے اسے اپنی جیب میں رکھ لیا۔ مولانا جب زنان خانہ سے کپڑے بدل کر آئے اور کالج جانے کے لیے باہر نکلے تو یہ سفید پوش گداگر پھاٹک کے پہلو سے لگے ہوئے کھڑے تھے اور اس بات کی انھوں نے شکایت کی کہ مولاناؒ نے ان کے خط کا جواب نہیں دیا۔ اس پر مولانا نے تعجب کا اظہار کیا تو انھیں بتایا گیا کہ وہ خط ایک دبلے پتلے لڑکے کو جو آپ کے مکان میں رہتا ہے دیا گیا تھا کہ آپ تک پہنچا دیا جائے۔ انھوں نے جو حلیہ بیان کیا اس سے مولاناؒ کو یقین ہو گیا کہ وہ گنہ گار میں ہی ہوں۔ فوراً بلوایا گیا اور حاضری پر مجھ سے پوچھا گیا کہ کوئی خط تمہیں دیا گیا تھا۔ میرے تسلیم کرنے پر مجھ سے خط طلب کیا گیا جسے میں نے پیش کر دیا، اسے دیکھ کر مولانا نے فرمایا: ”تم نے اور میں نے اس وقت حرام کھایا ہے اس لیے کہ اگر ایک مسلمان ہم سایہ فاقہ کرے تو مستطیع ہم سایہ پر غذا حرام ہوتی ہے اور جب میں نے

ان صاحب کے متعلق اپنی معلومات کے مطابق کچھ بتانا چاہا تو مولاناؒ نے فوراً روک دیا اور فرمایا اگر ایک شخص دس بار بھی جھوٹ بولے تو بھی یہ بات یقین کے ساتھ نہیں کہی جا سکتی کہ وہ آج بھی جھوٹ کہہ رہا ہے اگر انھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ صحیح ہے تو ہم لوگوں نے بڑی معصیت کی۔ میں نے کھا لیا اور تم نے بھی، اس پر میں نے عرض کیا کہ آپ کو اس وقت تک نہ تو خط ملا تھا اور نہ آپ میں استطاعت تھی کیونکہ آپ کے پاس صرف ایک روپیہ تھا جو گاڑی کا کرایہ ہوتا۔ اس پر مولانا نے فرمایا کہ میں غیر مستطیع تھا تم تو نہیں تھے۔ اس پر میں نے کہا میں نے وہ روپے اس لیے چھوڑ رکھے تھے کہ اس کی شکر منگواؤں گا (کیوں کہ چائے پر روزانہ وحید الدین سلیم وغیرہ کی نشست مولانا کے یہاں ہوتی تھی)۔ اس پر مولانا نے فرمایا۔ میں پیدل بھی یہاں سے کالج جا سکتا تھا۔ اور وہی روپیہ نکال کر ان صاحب کے حوالہ کیا اور کہا کہ فوراً جائیے اور بال بچوں کی غذا کا سامان کیجئے۔ میں کالج جا رہا ہوں۔ (۸)

مؤخر الذکر دونوں واقعات کو سن کر بے ساختہ سورۂ مومنون کی یہ آیت یاد آ جاتی ہے:

وَالَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَآ اٰتَوْا وَّقُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ اَنَّهُمْ اِلٰى رَبِّهِمْ رٰجِعُوْنَ ﴿۶۰﴾ (المومنون:۶۰)

''اور وہ لوگ جو دیتے ہیں تو جو کچھ دیتے ہیں اس حال میں دیتے ہیں کہ ان کے دل ڈرتے ہیں کہ انھیں اپنے رب کی طرف لوٹنا ہے۔''

اور ایسے مومنین کے بارے میں ارشاد ہے:

وَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۗ (الحشر:۹)

''اور وہ لوگ اس سے اپنے دلوں میں کوئی خلش نہیں محسوس کرتے جو کچھ ان لوگوں کو دیا گیا ہے اور وہ اپنے اوپر ان کو ترجیح دیتے ہیں اگرچہ انھیں خود احتیاج ہو۔''

سرسید سے صاف گوئی

قیام علی گڑھ کے زمانہ میں ہی سرسید احمد خانؒ کو اپنی تفسیر (تفسیر احمدی) کا عربی میں

ترجمہ کرانے کا خیال پیدا ہوا اور اس کام کے لیے ان کی نظرِ انتخاب پہلے تو علامہ شبلی نعمانی پر پڑی لیکن جب انھوں نے اپنی بعض مشغولیتوں کے باعث انکار کر دیا تو سرسید نے اس کے لیے مولانا فراہیؒ کو منتخب کیا لیکن مولانا نے صاف لفظوں میں فرما دیا کہ میں اس اشاعت معصیت میں کوئی حصہ نہیں لینا چاہتا۔(۹)

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مولاناؒ دینی معاملات میں کتنے محتاط، اصول پسند، غیرت منداور بے لچک تھے۔ اپنے ضمیر کی آواز پر انھوں نے نہ تو سرسید کی کوئی رورعایت کی اور نہ حق کے معاملہ میں کسی ذاتی مفاد اور وابستگی کی پروا۔

جو طمع نہیں رکھتا کسی سے نہیں ڈرتا

۱۹۱۴ء میں مولاناؒ حیدر آباد منتقل ہو گئے جہاں وہ دار العلوم حیدر آباد کے عہدۂ صدارت پر فائز ہوئے، لیکن مولانا نے قیام حیدر آباد کے اس زمانہ میں اپنی مصروفیات اور اپنے مشاغل کو صرف تعلیمات ہی تک محدود رکھا، وہاں کے امراء اور نوابوں سے ربط وضبط رکھنا انھیں قطعاً پسند نہ تھا۔ البتہ خاص خاص اہل علم سے ان کے مراسم رہے۔ جو لوگ اس زمانہ کے حیدر آباد اور نظام حیدر آباد سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ کسی شخص کا نظام سے ایک مرتبہ بھی شرف ملاقات پا لینا اس کے نزدیک کتنی اہم بات تھی۔ اور یہاں حال یہ تھا کہ مولاناؒ خود نظام کی خواہش کے باوجود ملاقات سے کتراتے رہے اور دربار عالیہ تک جانے کے لیے تیار نہ تھے، بہ دقت تمام راضی بھی ہوئے تو اس ملاقات کے موقع پر ہی انھیں ترک حیدر آباد کی اطلاع دے دی اور نواب حیدر آباد کے زیر سرپرستی چلنے والے دار العلوم (حیدر آباد) جیسی عظیم درس گاہ اور اس کے بیش قرار مشاہرہ کو خیر آباد کہہ کر خدمتِ دین وملت کے جذبہ سے مدرسۃ الاصلاح جیسی گوشۂ فقر وگم نامی میں پڑی ہوئی درس گاہ میں آ کر مقیم ہو گئے۔ مولاناؒ فراہی کے نزدیک اس ملاقات کی کیا حیثیت تھی اس کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ ”جب مولاناؒ ملاقات کر کے نکلے تو غالباً سر اکبر حیدری نے مولانا سے پوچھا کہ کہیے اعلیٰ حضرت سے کس طرح باتیں ہوئیں؟ مولانا نے جواب دیا جس طرح آپ سے ہوتی ہے۔ سر اکبر حیدری نے اس پر کہا کہ اب ہم بے خوفی کا راز سمجھ گئے، جو شخص

طمع نہیں رکھتا وہ کسی سے نہیں ڈرتا۔(۱۰)

والد کے خلاف فیصلہ

مولانا نہایت کھرے اور حد درجہ انصاف پسند آدمی تھے۔حق کے معاملہ میں اپنے عزیزوں اور بزرگوں تک سے کسی رورعایت برتنے یا اسے روار کھنے کو جائز نہ رکھتے تھے، بے جا پاس داری وجانب داری کا تصور تک ان کے نزدیک معصیت تھا۔مولانا امین احسن اصلاحیؒ مولاناؒ کی انصاف پسندی اور آپ کی ذات پر مخالفین کے حسن اعتماد کا ایک واقعہ یوں نقل کرتے ہیں:

> ''مولاناؒ کے والد کے خلاف جائداد کا ایک مقدمہ تھا،اس مقدمہ میں فریق مخالف نے مولاناؒ کو حکم مان لیا،مقدمہ فیصلہ کے لیے عدالت سے مولانا کے پاس منتقل ہو گیا،اور مولانا نے اس کا فیصلہ اپنے والد کے خلاف کر دیا جس کے نتیجہ میں مولانا کے والد کی جائداد کا ایک اچھا خاصہ حصہ (جو بالآخر مولانا ہی کی طرف منتقل ہوتا) ان کے قبضے سے نکل گیا۔(۱۱)

بھائی کے خلاف گواہی

اس سلسلے کا ایک اور واقعہ ہے جو عام طور سے اس دور کے لوگوں کا زبان زد ومشہور واقعہ ہے۔

> ''مولانا فراہیؒ کے چھوٹے بھائی جناب حاجی رشید الدین صاحب مرحوم ومغفور نے ایک مرتبہ اپنے کسی آسامی کو اس کی غلطی پر خفگی میں ایک چپت رسید کر دیا۔اتفاق کی بات اسی ایک چپت سے اس غریب کی موت ہوگئی۔متوفی کے ورثاء نے عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا اور گواہی میں مولانا فراہیؒ کو طلب کرا لیا۔مولانا نے گواہی دی کہ یقیناً رشید الدین نے تھپڑ رسید کیا تھا اور موت بھی اسی تھپڑ کے چوٹ کے نتیجہ میں ہوئی ہے لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ رشید نے یہ تھپڑ صرف تادیباً لگایا تھا اس کا ارادۂ قتل سے کوئی تعلق نہ تھا۔''(۱۲)

ان واقعات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مولاناؒ کے اندر کس درجہ کا تقویٰ، پرہیز گاری، خوفِ خدا اور قرآن وسنت سے تمسک کا جذبہ تھا۔ ان کی کیفیت تقویٰ نہ تو کسی کے جاہ وحشمت سے متاثر ہوتی تھی اور نہ عزیز واقارب یا مال وجائداد کی محبت، نہ کسی بزرگ ومربی کی عقیدت سے اثر پذیر ہوتی تھی، انھیں اگر پاس ولحاظ تھا تو کتاب وسنت کا، خوف تھا تو صرف خدا کا، ان کے ہر نرم وگرم رویے کا محرک الحب للہ والبغض للہ کے تحت صرف احقاق حق اور قیام عدل وقسط ہوتا تھا، نہ ان کے یہاں جانب داری تھی نہ مداہنت، نہ حرص وطمع تھی نہ مفاد پرستی ودنیا طلبی، ہر حال میں ان کا کردار ایک پیروحق وصابر وشاکر بندے کا کردار ہوتا تھا۔

مولانا حد درجہ کم آمیز انسان تھے، بالخصوص بڑے لوگوں کی صحبت اور ان سے ملنے جلنے سے بچتے تھے۔ ان کی گفتگو ہمیشہ علمی اور دین دارانہ ہوتی تھی۔ اور وہ بھی بقدر ضرورت واجبی ومختصر، آپ کی مجالس خواہ مخواہ کی فضول باتوں، طنز وتعریض اور طعن وتشنیع جیسے رزائل کی آلائشوں سے بالکل پاک ہوتی تھیں، آپ کے شرکاءِ مجلس پر آپ کے زہد وتقویٰ، دنیا اور آسائش دنیا سے بے نیازی، خوفِ خدا اور استحضارِ آخرت کا ایسا اثر پڑتا تھا کہ آدمی تا دیر بڑھی ہوئی کیفیت ایمانی کا لذت آشنا اور بے ثباتیِ دنیا کا حقیقت شناس رہتا۔ علامہ شبلی نعمانیؒ کی اس سے متعلق تاثراتی شہادت ہے کہ ''حمید کے پاس بیٹھ کر آدمی کا دل دنیا سے اچاٹ ہوجاتا ہے''۔(۱۳)

نماز کا اہتمام

مولانا کا مستقل معمول تھا کہ آپ رات کے پچھلے پہر میں پابندی کے ساتھ نماز اور مطالعہ وتدبر قرآن کا اہتمام فرماتے تھے۔ مولانا کا خیال تھا کہ ''مسلمانوں کے موجودہ مصائب کا علاج نماز بالخصوص شب کی نماز ہے''(۱۴) چنانچہ مولانا نمازیں اتنے خشوع وخضوع اور اس درجہ اہتمام کے ساتھ ادا کرتے تھے کہ بہ فحوائے حدیث نبویؐ ''کأنك تراہ'' واقعی وہ اپنے خدا کے سامنے کھڑے ہیں۔ علامہ سید سلیمان ندوی صاحبؒ لکھتے ہیں:

> ''ہم گنہ گاران کی مغفرت کی دعا کیا مانگیں کہ ان کے انفاس متبرکہ ہمہ تن یاد خدا، صبر ورضا، شکر وتسلیم میں صرف ہوتے تھے۔ ان کی نماز ہمہ تن لطف ومحویت ہوتی تھی۔ ان کو دیکھ کر خدا یاد آتا تھا''۔(۱۵)

مفسر قرآن مولانا عبد الماجد دریابادیؒ نے مولاناؒ کے علم وفضل کا اعتراف کرتے ہوئے ان کے اہتمام نماز کے سلسلے میں لکھا ہے:

''ان کے (علامہ شبلیؒ کے) ایک خالہ زاد بھائی مولانا حمید الدین فراہیؒ تھے۔ علم وفکر کے دریا، تقویٰ اور حسن عمل کے پیکر، عربی ادب کے فاضل متبحر اور قرآنیات کے نکتہ شناس، اوقاتِ نماز کی پابندی کا اس شدت سے اہتمام میں نے اپنی زندگی میں دو ہی شخصیتوں میں پایا، ایک یہی مولانا فراہیؒ دوسرے اکبرالٰہ آبادی۔'' (۱۶)

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:

''مولانا کی عبادت اور مذہبیت قابل دید تھی، نماز کی اولیت وقت کا اہتمام رکھتے، ایسا اہتمام میں نے ایک ہی جگہ اور دیکھا ہے اور وہ شخصیت حضرت الٰہ آبادی کی تھی، مولانا خود ہی سرگرم نمازی تھے، دوسرے بھی ان کی ہیبت سے نمازی بن جاتے تھے۔ جب تک مولانا کا قیام رہتا احاطہ دارالمصنفین کے اندر نماز کا خوب چرچا رہتا''۔

مدرسۃ الاصلاح کے دورِاول کے ایک ممتاز طالب علم مولاناؒ کے تقویٰ، خلوص عمل اور تعلق باللہ کا تذکرہ کرتے ہوئے مولانا کی شب بیداری، تہجد گزاری اور تدبر قرآن کے بارے میں لکھتے ہیں:

''اس زمانہ میں حضرت امام فراہیؒ ہفتہ میں تین دن نماز فجر کے بعد صرف متخرجین کو قرآن مجید کا درس دیتے تھے۔ اور قدیم سفالہ پوش درس گاہ کے شمال مشرقی حجرے میں قیام فرماتے تھے۔ اس اثنا میں میرے مشاہدے کا دعویٰ یہ ہے کہ حضرت امام فراہیؒ ایک مستند صوفی اور بے مثال متقی ولی اللہ تھے۔ میں نے دیکھا وہ روزانہ اپنے حجرے سے پورب کی طرف رکھے ہوئے مٹکوں سے بارہ بجے شب کے بعد غسل اور وضو فرماتے تھے پھر اپنے حجرے میں آکر نوافل سے فارغ ہوکر نماز فجر تک قرآن مجید میں تدبر فرماتے تھے اور اس میں اس قدر محو ہو جاتے کہ پاس کے آدمی سے بھی باخبر نہیں ہوتے تھے۔'' (۱۷)

سنت کا اہتمام

مولانا فراہیؒ سنت کے نہایت سخت متبع تھے۔ مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

''اتباع سنت کے معاملہ میں وہ اپنا اور اپنے شاگردوں اور دوستوں کا جزئیات پر بھی

احتساب کرتے تھے۔ بعض مرتبہ نئے تعلیم یافتہ حضرات سے بدمزگی بھی ہوجایا کرتی تھی۔ ایک مرتبہ وہ خود مجھ پر اس بات سے معترض ہوئے کہ میرے پائنچے ٹخنوں سے نیچے تھے۔ میں اس زمانہ میں اس طرح کے اعتراضات کو مولویانہ خردہ گیری خیال کرتا تھا۔ چنانچہ میں نے مولانا جیسے حکیم کی طرف سے اس اعتراض کو کچھ عجیب سا محسوس کیا اور اپنے اس احساس کو مولانا پر ظاہر بھی کر دیا۔ گفتگو کچھ بڑھی اور وہ حدیثیں زیر بحث آگئیں جو اس بارے میں وارد ہیں۔ میں نے ان احادیث کے متعلق اپنا نقطۂ نظر پوری قوت کے ساتھ پیش کیا۔ لیکن مولانا نے جواب میں ایک حکیمانہ بات فرمائی جو میرے دل میں اتر گئی۔ میں نے فوراً عرض کیا اگر یہ بات ہے تو میں اس پر نہایت خوشی سے راضی ہوں کہ آپ اپنے ہاتھ سے میرے پائنچے اتنے کاٹ دیں جتنے حدود شرع سے زائد ہیں۔ مولانا نے فوراً ہنستے ہوئے قینچی منگوائی اور فی الواقع اپنے ہاتھ سے میرے پائنچے اتنے کاٹ دیے جتنے ٹخنوں سے نیچے تھے۔

اسی طرح ایک مرتبہ ڈاڑھی کے مسئلہ پر بھی بحث چھڑ گئی۔ مولانا دین میں اس کی اہمیت واضح کر رہے ہیں اور میں ان کے سامنے یہ بات پیش کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ دین میں ڈاڑھی کو فی الواقع وہ اہمیت نہیں ہے، جو اس کو دی جا رہی ہے۔ مولانا کچھ دیر تک تو مجھے ان احادیث کا مطلب سمجھاتے رہے جو اس بارے میں وارد ہیں لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ میں ڈاڑھی کی اہمیت کا کسی طرح قائل نہیں ہو رہا ہوں تو فرمانے لگے کہ اچھا فرض کیا کہ اس کی دین میں بہت زیادہ اہمیت نہیں ہے لیکن کیا اس حقیقت سے انکار کیا جاسکتا ہے کہ یہ چھوٹی سی چیز بہت بڑی چیزوں کا پتہ دیتی ہے؟ میں نے عرض کیا وہ کیسے؟ فرمایا: جس طرح راکھ کی ایک چٹکی اڑا کر ہم ہوا جیسی عظیم الشان چیز کا پتہ چلا لیتے ہیں کہ اس کا رخ کدھر کو ہے اسی طرح ایک شخص کے چہرے پر ڈاڑھی کے ہونے اور نہ ہونے سے ہم یہ اندازہ کر لیتے ہیں کہ اس کا میلان کس کی طرف ہے''۔

سادگی

مدرسۃ الاصلاح میں مولاناؒ کا معیار زندگی بالکل وہی تھا جو اس سادہ مزاج مدرسہ کے سادگی پسند اساتذہ اور طلبہ کا تھا، نہ کوئی ملازم نہ کوئی خادم، مولانا اپنی چارپائی اور اپنا بستر خود ہی

ٹھیک کرتے۔ مولانا امین احسن اصلاحی کے الفاظ میں:

''ہماری ہی طرح سادہ اور غریبانہ کپڑے پہنتے، ہمارے ہی ساتھ ٹاٹ پر بیٹھتے، ان کی باعظمت پیشانی اور ان کے نورانی چہرہ کے سوا کوئی اور چیز بھی ایسی نہیں تھی جس سے ایک اجنبی ہمارے درمیان ان کی بڑائی کا اندازہ کرسکتا تھا، اور یہ تو ان کو دیکھ کر کسی کو گمان بھی نہیں ہوسکتا تھا کہ علوم مشرقیہ اور علوم مغربیہ کا یہی وہ مجمع البحرین ہے جو مولانا شبلی نعمانیؒ جیسے محقق کا مرجع استفادہ رہ چکا ہے۔'' (۱۸)

تقویٰ غالب تھا یا علم

مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

''مولانا فراہی کے متعلق ان کے جاننے والوں میں ہمیشہ یہ بحث رہی ہے کہ ان کا علم زیادہ تھا یا تقویٰ؟ اور واقعہ یہ ہے کہ ان دونوں پہلوؤں میں سے یہ متعین کرنا مشکل ہے کہ ان کی زندگی کا راجح پہلو کون سے تھا۔'' (۱۹)

معاصرین کی شہادت

مولانا کی وفات پر یا اس کے بعد بھی ان کے معاصر علماء نے جب مولانا پر قلم اٹھایا ہے تو مولانا کے علمی تبحر اور ان کی مجددانہ قرآنی خدمات کا جہاں کھلے دل سے اعتراف کیا ہے وہیں مولانا کے زہد و ورع اور خلوص و تقویٰ کی شہادت بھی دی ہے۔ چند شہادتیں ملاحظہ ہوں۔

امام الہند مولانا ابوالکلام آزادؒ نے مولانا کے تقویٰ اور ان کی طہارتِ قلب کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے:

''مولانا حمید الدین مرحوم ان علمائے حق میں سے تھے جن کا سرمایۂ امتیاز صرف علم ہی نہیں ہوتا، بلکہ عمل بھی ہوتا ہے اور اس دوسری جنس کی کامیابی کا جو عالم ہے وہ اہل حق سے پوشیدہ نہیں، میں جب کبھی ان سے ملا مجھ پر ان کے علم سے زیادہ ان کی عملی پاکی کا اثر ہوا۔ وہ پورے معنوں میں ایک متقی اور راست باز انسان تھے، ان کے دل کی پاکی اور نفس کی طہارت کو دیکھ کر رشک ہوتا تھا۔'' (۲۰)

علامہ سید سلیمان ندویؒ نے مولاناؒ کی قرآنی خدمات پر شاندار خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے مولانا کے علم وفضل اور زہد وورع کے بارے میں لکھا ہے:

''مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ نہ صرف علم وفضل میں یکتائے زمانہ تھے بلکہ اپنی صحتِ اعتقاد اور زہد وتقویٰ کے لحاظ سے خواص امت میں تھے۔'' (۲۱)

مولانا فراہیؒ کی وفات پر مجلہ ''معارف'' کے شذرات میں ان الفاظ میں ماتم کیا ہے:

''آج سب سے پہلی دفعہ ہم نئے عہد کے سب سے پہلے عالم کی وفات کے لیے ماتم میں مصروف ہیں، ہم ایک ایسے گریجویٹ عالم کا ماتم کرتے ہیں جو اپنے علم وفضل، زہد وورع اور اخلاق وفضائل میں قدیم تہذیب کا نمونہ تھا، لیکن اپنی روشن خیالی، جدید علوم وفنون کی اطلاع وواقفیت اور مقتضیات زمانہ کے علم وفہم میں عہد حاضر کی سب سے بہتر مثال تھا۔'' (۲۲)

مفسر قرآن مولانا عبد الماجد دریابادیؒ نے مولانا فراہیؒ کی تحقیقات قرآنی کا کھلے دل سے اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے:

''خدمت قرآن کے مدعی تو بہت ہیں، لیکن مولانا اپنی دقتِ نظر، عمیق فکر، حکیمانہ ژرف نگاہی، علم وفضل، تبحر ادبی اور تقویٰ وطہارت کے لحاظ سے اپنی نظیر آپ تھے۔'' (۲۳)

عالم عرب کے ممتاز ادیب اور مشہور مراکشی محقق عالم شیخ تقی الدین ہلالیؒ نے مولانا کے اخلاق وعادات، عبادات اور ان کی عربی دانی پر بڑے ہی شاندار الفاظ میں تبصرہ کیا ہے، جس کے چند جملے یہاں نقل کیے جارہے ہیں:

''علمائے ہند میں تو کجا، علمائے عرب میں بھی ایسے قادر الکلام خال خال ہیں''

اس کے بعد مولانا کی تفسیر پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''میں نے خود ان کی زبان سے ان کی تفسیر کا خطبہ سنا ہے اسے سن کر میری آنکھیں ابل پڑیں۔'' پھر آگے چل کر لکھتے ہیں:
''مختصر یہ کہ میں اب تک جن جن شخصیات سے ملا، علم وفضل کے لحاظ سے ان کو سب سے بلند پایا۔'' (۲۴)

مولانا سید عبد الحی سابق ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ اپنی مایہ ناز تصنیف ''نزہۃ الخواطر'' میں مولانا فراہی کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

''وہ (مولانا فراہی) چوٹی کے علماء میں سے تھے، زہد وعفت، نیک نفسی اور بلند ہمتی کی وہ تصویر تھے، لایعنی باتوں سے بہت دور، ابنائے دنیا سے بالکل بے پروا، عربی علوم میں انھیں رسوخ حاصل تھا۔'' (۲۵)

اخبارات ورسائل کی شہادت

مولانا کی وفات کے بعد اس وقت کے بہت سے علمی رسائل وجرائد نے بھی مولانا کے علم وفضل اور خشیت الٰہی کا بہت ہی کھلے لفظوں میں اعتراف کیا ہے۔ چند اعترافات ملاحظہ ہوں۔

رسالہ ''فاران'' بجنور اپنی ایک اشاعت میں مولاناؒ کے بارے میں لکھتا ہے:

''مولانا کے زہد وتقویٰ اور ان کے اسلامی درد ومحبت اور شیفتگی کا جو عالم سالہا سال تک میں اپنی آنکھوں سے دیکھتا رہا ہوں وہ مجھے اس اقرار پر مجبور کرتے ہیں کہ مولانا نہ صرف اپنے علم وفضل کے اعتبار سے فقید المثال اور یکتائے زمانہ تھے بلکہ اپنی صحت اعتقاد اور زہد وتقویٰ کے لحاظ سے بھی بہت زیادہ ارفع واعلیٰ مقام پر فائز تھے، ممکن ہے اس اعتراف کو آپ ایک بے خبر اور کور نظر کے حسن ظن یا بے خبری کا نتیجہ قرار دیں۔ لیکن کتنے اہل دل اور اہل نظر ہیں جو مولانا حمید الدین کو تقویٰ وتقدس کے لحاظ سے خدارسیدہ بزرگوں اور خواص امت میں شمار کرتے ہیں'' (۲۶)

ہفتہ وار ''سہیل'' اعظم گڑھ اپنے ایک افتتاحیہ مقالہ میں لکھتا ہے:

''مولانا حمید الدین فراہیؒ (صاحب تفسیر نظام القرآن) جس سے بڑا اس کی زندگی میں پوری دنیائے اسلام میں قرآن کا کوئی عالم نہیں تھا۔ جس نے تیس برس کامل قرآن کے تدبر وتفکر اور غور وفکر میں گزارا تھا، جو نماز اس خضوع اور خشوع اور توجہ وانابت کے ساتھ پڑھتا تھا کہ دیکھنے والوں کو بس خدا یاد آجاتا تھا، جو قرآن کا حافظ، زاہد شب زندہ دار اور تہجد گزار تھا۔'' (۲۷)

جامعہ دارالسلام، عمر آباد (تمل ناڈو) کا ترجمان ''مصحف'' اپنی ایک اشاعت میں لکھتا ہے:

''علامہ حمید الدین فراہی نور اللہ مرقدہ کی بلند پایہ شخصیت اپنے علمی تبحر، دقت نظر اور بلندیِ فکر بالخصوص حقائق قرآنی و معارف قرآنی کی دست گاہ کے اعتبار سے اہل علم وفضل میں کسی تعریف وتعارف کی محتاج نہیں۔ موصوف اس دور کے بہترین مفسر قرآن تھے، جن میں بہ یک وقت علوم عربیہ کے ساتھ فنون جدیدہ و معارف عصریہ بدرجۂ اتم موجود تھے اور نہ علم ہی کے لحاظ سے بلکہ عمل صالح اور تقدیس کے اعتبار سے علامہ مرحوم کا وجود اپنی نظیر آپ تھا۔'' (۲۸)

یہ تھیں مولانا فراہیؒ کے خلوص وتقویٰ کے سلسلے میں چند اکابر علماء کی شہادتیں اور بعض معروف علمی وادبی رسائل وجرائد کا مولاناؒ کی شخصیت پر تبصرہ جنھیں نہایت ہی اختصار کے ساتھ یہاں نقل کیا گیا ہے، جن سے ہمیں تاثر ملتا ہے کہ مولانا تقویٰ، للّٰہیت، زہد وورع، محبت خدا ورسول اور صبر وعزیمت کی سچی تصویر تھے۔

مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں کہ مولانا کی وفات کے بعد میں ایک مخدوم بزرگ (مولانا عبد الرحمٰن محدث مبارکپوری صاحب تحفۃ الاحوذی) کی خدمت میں جب حاضر ہوتا تو وہ اکثر فرماتے:

تعال نؤمن ساعةً (۲۹) ''آؤ تھوڑی دیر ایمان کو تازہ کرلیں۔''

مقصد یہ ہوتا کہ مولاناؒ کے ایمان افروز واقعات کا تذکرہ کر کے اپنی حرارتِ ایمانی میں کچھ اضافہ کرلیں۔ (۲۹)

مولانا فراہی کی علالت متھرا میں (جہاں وہ بغرض آپریشن تشریف لے گئے تھے) جب زیادہ بڑھ گئی تو تار دے کر اپنے عزیزوں کو بلوایا اور خصوصیت کے ساتھ مولانا امین احسن اصلاحی کو بھی طلب کیا، جب مولانا اصلاحی پہنچے تو مولانا فراہی نے جہاں ان سے اور بہت ساری باتیں کہیں وہیں بھینچ کر یہ جملہ بار بار فرمایا کہ ''دنیا جی لگانے کی چیز نہیں ہے۔'' (۳۰)

آخری لمحات میں مولانا کے اس فقرے سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ مولانا کی نظر ہمیشہ مآلِ آخرت اور طلب رضائے الٰہی پر رہتی تھی، ان کے نزدیک دنیا کے مال ومتاع اور جاہ وحشمت

کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ انھوں نے بہ مصداق: کن فی الدنیا کأنك غریب اور عابر سبیلٍ ''دنیا میں یوں زندگی گزاری اور اس طرح سے رخصت ہوئے جیسے کوئی مسافر حالت مسافرت سے گزرتا اور اپنی منزل مقصود کو جالیتا ہے۔ ساتھ ہی اپنے متعلقین واعزہ کو بھی یہ وصیت فرمائی کہ تم لوگ اپنے واحد نصب العین یعنی مرضیِ مولیٰ کی طلب سے کبھی غافل نہ ہونا، دنیا کی شان وشوکت اور اس کی رعنائی وزیبائی سے ہوشیار رہنا، اس کی دل کشی تمھیں اپنے دام تزویر میں پھنسا کر خوشنودیِ رب اور آخرت کی کام یابی وکامرانی سے محروم نہ کردے جو انسان کی زندگی کا اصل مطمح نظر ہے۔

یہ ہے مولانا فراہی کی متقیانہ زندگی کا وہ روشن پہلو جس سے ایمان کی حرارت رگوں میں دوڑ جاتی ہے، دل ودماغ کو طمانیت اور روح کو بالیدگی حاصل ہوتی ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے قرن اول کا کوئی شیفتہ کتاب وسنت تیرہویں صدی کے آخر میں دوبارہ اس عالم رنگ وبو میں نمودار ہو گیا تھا۔

حواشی و مراجع

۱- مختصر حیات حمید، ص: ۵۲ مرتبہ عبدالرحمن ناصر اصلاحی، ناشر: مدرسۃ الاصلاح، سرائے میر اعظم گڑھ۔

۲- // // // // // //

۳- // // // // // //

۴- علّامہ حمید الدین فراہی ایک عظیم مفسر، ص: ۱۲۔۱۱، عنایت اللہ اسد سبحانی، ناشر: ایضاً

۵- ماہنامہ تہذیب الاخلاق، شمارہ ۱۱ ج ۶ ص: ۱۰ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

۶- // // // // //

۷- // // // // ص: ۱۱، ۱۲ //

۸- // // // // ص: ۱۲۔ ۱۳ //

۹- مختصر حیات حمید، ص: ۳۶

۱۰- // // // // ص: ۳۸۔ ۳۷ //

۱۱- // // // // ص: ۵۳ //

۱۲- // // // // ص: ۵۵ //

۱۳- ماہنامہ الاصلاح، شمارہ ۸ ج ۱ ص: ۷ مرتبہ امین احسن اصلاحی، ناشر: مدرسۃ الاصلاح، سرائے میر اعظم گڑھ

۱۴- علامہ حمید الدین فراہی ایک عظیم مفسر، ص: ۴۲

۱۵- آپ بیتی، مولانا عبدالماجد دریابادی، ص ۳۵۸: مکتبہ فردوس، مکارم نگر لکھنؤ

۱۶- علامہ حمید الدین فراہیؒ حیات و افکار، مقالات فراہی سیمینار ص ۳۵: دائرہ حمیدیہ، مدرسۃ الاصلاح سرائے میر، اعظم گڑھ

۱۷- مختصر حیات حمید ص: ۵۴، سرائے میر، اعظم گڑھ

۱۸- ایضاً ص: ۵۱،

۱۹- ماہنامہ الاصلاح، شمارہ ۱۰، ج ۱ ص ۵۴: مرتبہ امین احسن اصلاحی

۲۰- // // // // // //

۲۱- مختصر حیات حمید، ص: ۱

۲۲- علامہ حمید الدین فراہی ایک عظیم مفسر، ص: ۴۷

۲۳- ایضاً ۴۴:

۲۴- ایضاً: ۴۵

۲۵- ماہنامہ الاصلاح، شمارہ ۲/ج ۲/ص: ۶۴/مرتبہ امین احسن اصلاحی

۲۶- ماہنامہ الاصلاح، شمارہ ۱۰ ج ۱ ص: ۶۰

۲۷- // // //ص: ۶۱

۲۸- // // //ص: ۵۸

۲۹- مختصر حیات حمید، ص: ۶۵

۳۰- ماہنامہ معارف فروری ۱۹۹۱ء ص: ۱۰۵ کا حاشیہ، مرتب، ضیاء الدین اصلاحی

مولانا مقصود احمد اصلاحی

مولانا حمید الدین فراہیؒ اور نظم قرآن

ہندوستان دیگر ممالک کے بالمقابل اس حیثیت سے کافی معروف وممتاز ہے کہ جس وسیع پیمانے پر تعلیم قرآن اور اس کی تفسیر وتحقیق کا کام اس ملک میں انجام پایا دوسرے ممالک اس سے محروم رہے۔ یہاں بے شمار اربابِ تفسیر پیدا ہوئے اور انہوں نے کتاب اللہ کی تفسیر وتاویل کے جابجا ادارے قائم کیے، مدارس اور اداروں میں کثرت اور علمی وتحقیقی حلقوں کو وسعت حاصل ہوئی، فن تفسیر میں تدریسی وتحریری صلاحیت رکھنے والے علمائے کرام کی کاوشوں اور سالہا سال کی جاں کاہیوں سے لائبریریاں مالا مال ہوگئیں، چنانچہ فن تفسیر پر جس قدر کتابوں کی تدوین یہاں ہوئی ہے (اور ان شاء اللہ ہوتی رہے گی) شاید ہی کسی فن پر ہوئی ہو۔

لیکن اسی کے ساتھ جب ہندو بیرون ہند کے ارباب تفسیر کی تفسیروں کا بنظر غائر مطالعہ کیا جاتا ہے، اور اداروں کے طریقۂ تعلیم کا جائزہ لیا جاتا ہے تو یہ بات واضح ہو کر سامنے آتی ہے کہ علم قرآن اور اس کی تحقیق پر جو کام بھی ہوئے ہیں وہ سب یک رخے اور ادھورے ہیں۔ درحقیقت کتاب الٰہی پر جو توجہ صرف ہونی چاہیے تھی ان اہل تفسیر نے وہ توجہ صرف نہیں کی، انہوں نے کتاب اللہ کی تفسیر وتاویل اپنے عقیدہ ومسلک، نظریات وخیالات اور طرزِ فکر کے مطابق کی، اور یہ اپنے نظریات وخیالات کے رہینِ منت ہو کر رہ گئے اور بے جا تقلید واتباع کی شاہ راہ پر چل پڑے، نتیجہ یہ ہوا کہ اصل سر رشتۂ کلام ان کے ہاتھوں سے چھوٹ گیا اور ان کی

تفسیریں معروف و متداول اقوال کا مجموعہ بن کر رہ گئیں، جیسا کہ مولانا عنایت اللہ اصلاحی رقم طراز ہیں:

''اگر کوئی حنفی مکتبِ فکر کا تھا تو اس نے اس کے اندر حنفی اصولوں کی جستجو کی اور اسے فقہ حنفی کی تائید میں استعمال کیا، اگر کوئی مالکی تھا تو اس نے اس کے اندر مالکی اصولوں کی جستجو کی اور فقہ مالکی کی بنیادیں فراہم کرنے کی کوشش کی، اگر کوئی شافعی یا حنبلی تھا تو اس نے اسے تمام تر اپنے فکر و مسلک کے سانچے میں ڈھالنے کی سعی کی، اس نے مجموعی طور سے یہ تصور دینے کی کوشش کی کہ قرآن پاک سے اسی کے مسلک کی تائید ہوتی ہے اور اصلاً اسی کا مسلک قرآنی فکر کا آئینہ دار ہے۔''

(علامہ حمید الدین فراہیؒ۔ ایک عظیم مفسر، ص: ۳۵)

ارباب تفسیر و تاویل کی انہیں بے اعتدالیوں کی وضاحت صاحب مناہل العرفان نے اہل کلام کی تفسیر کے عنوان کے تحت کیا ہے:

''ہر انسان کے دل کی بات اس وقت ظاہر ہوتی ہے کہ جب وہ اپنے خیالات صفحۂ قرطاس پر منتقل کرتا ہے تو اس کا عقیدہ اس کی تالیف کے جھروکوں سے دکھائی دینے لگتا ہے، اسی طرح اس کی گفتگو کے درمیان سے اس کا عقیدہ ظاہر ہوجاتا ہے، علم کلام کے علماء کی بھی یہی کیفیت نظر آتی ہے جب وہ کتاب اللہ کی تفسیر کیا کرتے ہیں، چنانچہ سنی کی تفسیر سے اہل سنت کے انوار پھوٹتے ہیں، معتزلی کے بیان کے اردگرد اعتزال کی بو پھیلتی رہتی ہے، اور شیعی میدان تفسیر و تاویل میں تشیّع کی ہوا چلا کرتی ہے، البتہ ان کے درمیان تعصب، میانہ روی، ایجاز اور بسط و تفصیل کے لحاظ سے فرق و تفاوت ہوتا ہے، چنانچہ معتزلہ اور شیعہ کی تفسیر میں تم کو یہ بات نظر آتی ہوگی اور تم نے دیکھا ہوگا کہ زمخشری اپنے اعتزال کو کس طرح اعتدال و احتیاط کے ساتھ چپکے سے اذہان میں اتارنا چاہتا ہے اور کس طرح قاضی عبدالجبار علانیہ تعصب کا اظہار کرتا ہے اور کس طرح مولیٰ عبداللطیف تشیع میں اسراف سے کام لیتا ہے''

(تاریخ افکار و علوم اسلامی، راغب الطباخ، جلد اول صفحہ ۲۹۰)

لیکن عصر حاضر کے مفسرین میں مولانا حمید الدین فراہیؒ کو جو امتیازی شان اور بلند مرتبہ حاصل ہے، اس سے حق وانصاف کی زبان انکار نہیں کرسکتی۔ اگر بے جا پاس داری اور تعصب کی عینک اتار کر دیکھا جائے تو بلا جھجک یہ کہا جاسکتا ہے کہ تفسیری سلسلے میں جو منہج مولانا نے اختیار کیا، دوسرے مفسرین اس سے عاجز رہے۔ انہوں نے قرآنی تحقیق پر اپنی زندگی کے چالیس برس صرف کردیے، اس مدت میں کتابِ الٰہی پر ہر پہلو سے غور وفکر کیا، تفسیر قرآن کے سلسلے میں انہوں نے ایک نادر طریقہ اختیار کیا، دیگر مفسرین کی طرح نہ تو یہ کسی عقیدہ ومسلک کے پابند ہوئے اور نہ ہی اس راہ میں اپنے نظریے اور فکر کو راہ دی، اس لیے کہ کتاب الٰہی کی برتری اور علمِ تفسیر کی افضلیت مولانا کے پیش نظر تھی، جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے:

وَاِنَّهٗ لَكِتٰبٌ عَزِيْزٌ ﴿٤١﴾ لَّا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ ۭ تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ ﴿٤٢﴾ (حٰم السجدہ: ۴۱، ۴۲)

''یہ ایک زبردست کتاب ہے۔ باطل نہ سامنے سے اس پر آسکتا ہے نہ پیچھے سے، یہ ایک حکیم وحمید کی نازل کردہ چیز ہے۔''

كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿٢٩﴾ (ص: ۲۹)

''یہ ایک بڑی برکت والی کتاب ہے جو (اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم) ہم نے تمہاری طرف نازل کی ہے تاکہ یہ لوگ اس کی آیات پر غور کریں اور عقل وفکر رکھنے والے اس سے سبق لیں۔''

قرآن سے متعلق آپ کی کم وبیش بیس تصنیفات ہیں۔ بلاغت قرآن، اسلوب قرآن، مفردات قرآن، نحو قرآن، اوصاف قرآن، تاریخ قرآن، حکمت قرآن، حجج قرآن، نظام قرآن، اصول تاویل غرض یہ کہ مولانا نے ایک ایک عنوان کو سامنے رکھ کر قرآن کریم پر غور وفکر اور تدبر کیا ہے۔ اس کا اندازہ مولانا کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تالیفات وتصنیفات سے لگایا جاسکتا ہے۔

مولانا کی تفسیری خصوصیات میں سب سے امتیازی خصوصیت نظم قرآن اور اس کا باہمی ربط وتعلق ہے۔ درحقیقت یہی امتیازی خصوصیت مولانا کو مفسرین کی صفِ عام سے الگ کرتی ہے۔ اس فن کی اہمیت ہی کے پیش نظر مولانا نے مستقل ایک کتاب ''دلائل النظام'' تصنیف کی اور

اس میں یہ ثابت کیا ہے کہ قرآن حکیم کے اسرار و معارف، حکم و معانی اور اس کے محاسن کا بیشتر حصہ اس کی سورتوں اور آیتوں کے نظم کے اندر مخفی و پوشیدہ ہے، اس لیے اس کا انکار کرنا اور اس کتاب کو منتشر و متفرق احکام کا مجموعہ قرار دینا کتابِ الٰہی پر ظلم کرنے کے مترادف ہے۔ سر رشتۂ نظم قرآن کے چھوڑ دینے ہی کے نتیجہ میں مفسرین کرام نے ٹھوکریں کھائی ہیں اور ایک آیت کے صحیح مفہوم و مطلب کو چھوڑ کر دور از کار تاویلیں کی ہیں، نظم کلام کو پیش نظر رکھ کر انہوں نے قرآن کی تفسیر و تاویل کی ہوتی تو قرآنی آیات کی تفسیر میں ان کو دشواریوں اور مشکلوں کا سامنا نہ کرنا پڑتا بلکہ آیت کا مفہوم و مطلب ذرا سے تامل و تفکر سے خود بخود درست ہو جاتا ہے، انہوں نے یہ خیال کیا کہ قرآن کریم کا نزول مختلف اوقات میں حالات کی رعایت سے ہوا ہے، اس لیے اس میں نظم و ربط تلاش کرنا ایک کارِ عبث ہے، لیکن ان کی نظروں سے یہ حقیقت پوشیدہ رہی کہ اس کی موجودہ ترتیب ترتیبِ نزولی نہیں ہے بلکہ اس کی سورتوں کی ترتیب بعد کے ادوار کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر کی گئی ہے (اور یہ ترتیب من جانب اللہ عہد نبوی میں جبرئیل امین علیہ السلام کے ذریعہ ہوئی ہے۔) اس کا واضح ثبوت حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہد خلافت میں ملتا ہے جس کی تفصیل یہ ہے کہ جب ان کے دورِ خلافت میں قرآن کریم کو ایک مصحف میں جمع کر دینے کا ارادہ کیا گیا تو اس وقت مصحف میں وہی آیتیں لکھی جاتی تھیں جس کی گواہی دو افراد ''حافظ قرآن، کاتب وحی'' دیں۔ ظاہر ہے یہ عمل حضرت ابوبکرؓ محض آیت کے موقع و محل اور اس کے متعین مقام کو جاننے کے لیے کرتے تھے۔ ایسا نہیں تھا کہ حضرت ابوبکرؓ اسلوب قرآن سے ناواقف تھے۔

اسی کے ساتھ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ مولانا اپنے اس دعوے میں تنہا و منفرد نہیں ہیں بلکہ ان کے علاوہ بہت سے اساطین علم و فن ایسے گزرے ہیں جنہوں نے یہ تسلیم کیا ہے کہ قرآن مجید ایک منظم کلام ہے اور قرآنی حکمت کا ایک بڑا حصہ اس کے نظم کے اندر پوشیدہ ہے، اس نظریے کے حامل یہ حضرات ہیں۔

امام فخر الدین رازیؒ ۶۰۶ھ: یہ تنہا شخص ہیں، جنہوں نے اس کی طرف زیادہ توجہ دی ہے۔ انہوں اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ قرآنی حکمت کا بڑا حصہ ترتیب و نظم کے اندر پوشیدہ ہے۔
(مقدمہ تفسیر نظام القرآن)

علامہ برہان الدین بقاعیؒ ۸۸۵ھ۔

شیخ ولی الدین علویؒ۔

قاضی ابوبکر بن عربیؒ - یہ اپنی تصنیف سراج المریدین میں نظم سے متعلق ان لفظوں میں لکھتے ہیں کہ ''آیات قرآنی کے باہمی تعلق کو اس طرح سمجھنا کہ وہ ایک مسلسل اور مربوط کلام کے قالب میں ڈھل جائیں ایک عظیم الشان علم ہے۔'' (الاتقان فی علوم القرآن: السیوطیؒ جلد دوم ص ۱۲۴)

علامہ مخدوم علی مہائمیؒ ۸۳۵ھ انہیں مفسرین میں سے یہ بھی ایک ہیں جنہوں نے قرآن میں نظم وترتیب کو تسلیم کیا ہے، انہوں نے اپنی تفسیر کا نام تبصیر الرحمٰن وتیسیر المنان رکھا ہے۔ دراصل ہندوستان میں قرآن پاک کی تفسیر کا کام انہیں کے زمانے سے شروع ہوا ہے۔ نظم قرآن سے متعلق اپنی تفسیر کے مقدمے میں اس طرح رقم طراز ہیں:

> ''یہ نکات نظم قرآن کا بہترین مجموعہ ہیں جس پر مجھ سے پہلے بہت سے جن وانس کو دسترس حاصل نہیں ہوئی ہے، میں گنہ گار کہاں اس لائق تھا کہ ان تک پہنچ سکتا، جہاں صرف اللہ کے پاک بندے ہی پہنچ سکتے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل وکرم سے میرے لیے اس پیچیدہ اور مشکل کام کو آسان کردیا۔'' (مقدمہ تفسیر مہائمی اول)

بہرحال یہ اور اسی طرح کے اور بہت سے ارباب تاویل ہیں جنہوں نے نظم قرآن کی تلاش میں کوششیں کی ہیں اور اس نظریے کو اپنی تصنیفات میں اجاگر کرنا چاہا ہے، لیکن اس سلسلے میں ان کی کوششیں کسی نہ کسی جہت سے نامکمل ہیں۔ انہوں نے اس کے نظم وترتیب کو تسلیم تو کرلیا، لیکن مشکل مقامات کو نظر انداز کرگئے، گویا کہ فن نظم وترتیب کی جو بنیاد ان اساطینِ علم وفن نے ڈالی تھی، مولانا نے اس کی تکمیل کردی اور اس کی اہمیت وجامعیت کو لوگوں پر واضح کردیا، چنانچہ اس عظیم علم کے متعلق مولانا فرماتے ہیں:

> ''اللہ تعالیٰ کی توفیق وعنایت سے میں نے اپنی تفسیر نظام القرآن میں اس بات کی کوشش کی ہے کہ آیاتِ قرآنی کے باہمی تعلق کو واضح کروں اور قرآن مجید کی ایک ایسی سادہ وصاف تفسیر لکھوں جو ان تمام اختلافات سے بالکل پاک ہو جو ہمارے اندر عہدِ نبوت کے بعد پیدا ہوئے ہیں۔ میں نے ہر ہر سورہ کے نظام کو اس کی تہہ میں اتر کر اور اس کے سیاق کو سمجھ کر معلوم کرنے کی کوشش کی ہے، پھر اس جدوجہد سے جو کچھ سمجھ میں آیا ہے اس کو عقل ونقل سے پوری طرح مدلل کیا ہے۔'' (تفسیر نظام القرآن، ص:۵)

یہ عظیم الشان علم جس کے مشکل ہونے کے سبب اربابِ تفسیر کی ایک جماعت بلکہ اکثریت نے اس سے تعرض نہیں کیا، اور جنھوں نے تسلیم کیا مگر کما حقہٗ اس کی توضیح نہ کر سکے، مولانا پر کس طرح واضح ہوا، اس کی مشکلات کس طرح آسان ہوئیں، اس کے بارے میں لکھتے ہیں:

"مجھ پر نظم کا دروازہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل خاص سے سب سے پہلے سورہ بقرۂ اور سورۂ قصص میں کھولا اور اس کی طرف میری رہ نمائی باہر سے نہیں بلکہ خود قرآن کے اندر سے ہوئی، میں قرآن کی تلاوت کا ہمیشہ سے دل دادہ رہا ہوں اور اللہ تعالیٰ کا شکر گزار ہوں کہ میری سب سے زیادہ محبوب اور لذیذ کتاب یہی رہی ہے۔"

(تفسیر نظام القرآن، ص:۸)

مولانا کا یہ خیال تھا کہ وہ صحیفہ جس کے سامنے ایک ایسی قوم نے اپنی عاجزی و بے بسی کا اظہار کر دیا جو فصاحت و بلاغت میں یکتائے زمانہ تھی، متفرق پند و نصائح اور مختلف شرعی احکام کا مجموعہ نہیں بلکہ ایک ایسا کلام ہوسکتا ہے جس کی ایک آیت دوسری آیت سے، اور ایک سورہ دوسری سورہ سے منسلک و منضبط ہو، درحقیقت اس کا اعجاز بیان، فصاحت و بلاغت، اور اس کی روانی وانسجام کا اظہار اسی وقت ممکن ہے جب کہ یہ تسلیم کر لیا جائے کہ یہ صحیفۂ ربانی اول تا آخر منظم و مربوط ہے، اور نظم و ربط ہی فہم قرآن کی کلید ہے۔

مولانا کا خیال ہے کہ ہر سورہ کا ایک عمود ہوتا ہے جو فہم قرآن کے لیے بے حد ضروری ہے، اسے نظر انداز کر دینے سے ایک ایک آیت کا مفہوم و مطلب کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے، چنانچہ "دلائل النظام" کے صفحہ نمبر ۷۷ میں فرماتے ہیں:

"تم جان لو کہ عمود سورہ کی تعیین نظامِ سورہ کی معرفت کی کلید ہے لیکن یہ بہت مشکل علم ہے، اس لیے اس بات کی ضرورت ہے کہ مطالب سورہ اور جو اس سے قریب اور اس کی مماثل ہیں بار بار غور و فکر کیا جائے اور شدت تأمل سے کام لیا جائے، اس طرح عمود سورہ پوری طرح بے نقاب ہو جاتا ہے، اور اس کا نظام اس طرح آشکارا ہو جاتا ہے کہ ہر آیت کمزور تاویل سے پاک ہو جاتی ہے"

اسی طرح مولانا نے ہر سورہ کی تفسیر اس طرح کی ہے کہ ہر سورہ اپنی ماقبل و مابعد سورہ سے مربوط و منظم نظر آتی ہے۔ ایک سورہ کی دوسری سورہ سے اتنی گہری وابستگی ہے کہ اگر درمیان

سے کسی ایک سورہ کو نکال دیا جائے یا سورتوں کے درمیان تقدیم وتاخیر کر دی جائے تو اس کا حسن نظام مختل ہو جائے گا۔ گویا کہ قرآن ایک ہار کی مانند ہے جس کے درمیان سے اگر ایک موتی بھی نکال لیا جائے تو تمام موتی منتشر ہو جاتے ہیں اور ہار کی دل کشی اور خوب صورتی ختم ہو جاتی ہے۔ مولانا فرماتے ہیں:

> ''نظام سے ہمارا منشا یہ ہے کہ ہر سورہ مکمل ہو اور وہ ماقبل ومابعد کی سورہ سے پوری طرح وابستہ ہو''۔ (دلائل النظام)

توضیحاً نظم سورہ کی ایک مثال مولانا کی تفسیر سورۃ الشّمس سے پیش کی جاتی ہے:

> ''سابق سورہ ''سورۃ البلد'' میں اصحاب المیمنہ اور اصحاب المشئمۃ کا ذکر ہوا تھا، اصحاب المشئمۃ سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی قدر نہ پہچانی اور اس کی امانت اور بیت اللہ کے فرائض میں بدعنوانیاں کر کے بدبختی میں پڑے۔ اس سورہ میں ان لوگوں کے سامنے قوم ثمود کے اس بدبخت ترین لیڈر کو بطور مثال پیش کیا ہے جس نے اپنی سرکشی کی بدولت پوری قوم کو تباہی کے گڈھے میں ڈھکیلا تا کہ قریش دیکھ لیں کہ وہ بھی اسی بدبخت انسان کی روش پر چل رہے ہیں، انہوں نے بھی بیت اللہ کے اصل مقصد کو بالکل برباد کر دیا ہے اور آئندہ اپنے رسول کے ساتھ بعینہٖ اسی طرح کا معاملہ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں جو معاملہ ثمود نے اپنے رسول کے ساتھ کیا تھا، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جس طرح خانہ کعبہ کی بے حرمتی ان کی بدبختی اور نامرادی کا سبب ہوئی ہے، اسی طرح رسول کی بے حرمتی ان کی بربادی کی تکمیل ہوگی۔
>
> اس تنبیہ اور انذار کے بعد سلسلۂ سخن خلق خدا کے ساتھ محبت اور ہمدردی کے مضمون کی طرف متوجہ ہو گیا ہے اور نہایت اختصار کے ساتھ خدا کی راہ میں خرچ کرنے والے نیکوکاروں اور مال سمیٹ کر رکھنے والے بخیلوں کے انجام کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، چنانچہ انہیں کے انجام کار کی تفصیل بعد کی سورہ ''سورۃ اللیل'' میں آتی ہے۔''

مختصر یہ کہ قرآن حکیم میں تحقیق وجستجو اور خصوصاً نظم قرآن کو ایک مستقل فن قرار دے کر اس کے تمام گوشوں کو مکمل کرنا علم قرآن کی ایسی خدمت ہے جس کی وجہ سے مولانا فراہیؒ عام مفسرین سے منفرد نظر آتے ہیں اور بالیقین یہی چیزیں ہیں جن سے بڑے بڑے اساطینِ علم نے مولانا کی علمی وتحقیقی صلاحیتوں کا اعتراف کیا ہے۔

مولانا صدرالدین اصلاحی

مولانا حمید الدین فراہیؒ اور فی ملکوتِ اللہ

صحیح عمل کے لیے صحیح علم ہمیشہ سے ضروری رہا ہے اور جہاں تک اسلام کا تعلق ہے اس کی حد تک تو اس کلیہ کی صداقت سورج سے زیادہ روشن ہے۔ قرون خیر کے بعد پیروان اسلام جس عملی زوال سے دو چار ہوئے اور ہوتے چلے گئے اور امت مسلمہ، امت وسط اور خیر الامم کے مقام سے جو مسلسل نیچے گرتی چلی گئی اس کی ایک خاص اور بنیادی وجہ یہی اسلام کے صحیح علم وشعور کی خامی ہے اور علم وشعور کی اس خامی کا سرا جب تلاش کیا جاتا ہے تو وہ صفات الٰہی کے معانی و مقتضیات سے کم آگہی کے سوا اور کچھ نہیں قرار پاتا۔ اللہ کے دین حقیقی، بے آمیز، مکمل اور جامع و مانع علم کی یافت سرتاسر موقوف ہے اس بات پر کہ آدمی کا ذہن اللہ کی صفات کا صحیح علم اور مکمل و متوازن ادراک رکھتا ہو۔ لیکن اکثر و بیشتر اس میں ناکامی ہوتی رہی ہے، اس ناکامی کی وجہ صرف یہ تھی کہ اللہ کی ساری صفات کو تسلیم کرنے کے باوجود ان کے ٹھیک ٹھیک معانی و مقتضیات کے ادراک سے اور ان کے متوازن تصورات سے بعد پیدا ہو گیا تھا، حالانکہ صفات الٰہی کا یہی صحیح فہم اور متوازن تصور وہ چیز ہے جو دین وخدا پرستی کے صحیح مفہوم کی ضمانت ہوا کرتی ہے لیکن مختلف خارجی اور داخلی اسباب کی بنا پر لوگ اس صحیح و متوازن تصور کو اپنے شعور کی گرفت میں نہ رکھ سکے۔ بعض صفات کو تو پوری اہمیت کے ساتھ ذہنوں میں تازہ رکھا گیا مگر بعض کو وہ اہمیت نہ دی جاسکی جو دی جانی چاہیے تھی۔ دوسرے لفظوں میں بعض صفات کے تقاضے ذہنوں پر اس شدت بلکہ مبالغے

کے ساتھ حاوی کر لیے گئے کہ کچھ دوسری صفات کے تقاضے نظروں سے کسی نہ کسی حد تک اوجھل ہو کر رہ گئے ۔ یہ وہی غلطی تھی جس کا شکار ساری پچھلی قومیں وملتیں ہوتی رہیں ہیں، اور جب یہ غلطی ان کے یہاں اپنی انتہا کو پہنچ گئی تو اللہ کی کتاب رکھنے کے باوجود وہ دین وخدا پرستی کے ایسے جاہلانہ تصورات کے بیاباں میں کھو کر رہ گئیں جہاں جہل وگمراہی کی حیرانیوں کے سوااور کچھ نہ تھا۔

ان صفات خداوندی میں سے جن کے ساتھ ماضی بعید میں مسلسل یہ ظلم ہوتا رہا، حاکمیت کی صفت سرفہرست ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی اسی عظیم اور اہم ترین صفت کے نہ سمجھ پانے کا نتیجہ ہے کہ مجوس دوخداؤں کے قائل بن گئے ، نصاریٰ کے عقائد میں ایک طرف تو تین تین الوہیتوں کا عقیدہ شامل ہو گیا۔ دوسری طرف یہ خیال بھی ان کے ذہنوں میں بار پا گیا کہ دنیا شیطان کے زیر فرمان ہے۔ حتیٰ کہ خود مسلمانوں میں کا بھی ایک گروہ، معتزلہ کا گروہ، اس بات کا قائل بن گیا کہ اپنے اعمال بد کے خالق، انسان خود ہی ہیں، خدا نہیں ہے اور جہاں تک دین وسیاست کی تفریق کا سوال ہے اس نظریے کے سیلاب میں تو بہہ جانے والوں کا کوئی شمار ہی نہیں کیا جا سکتا۔

جہاں تک امت مسلمہ کا تعلق ہے، تسلیم کرنا پڑے گا کہ اللہ کی اس صفت کا حق پہچاننے میں وہ بھی پوری طرح کام یاب نہ رہ سکی۔ بلا شبہ کوئی بھی مسلمان اس صفت کا نہ منکر ہے نہ اس سے یکسر نابلد۔ سبھی کا اس پر ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ایک صفت لاشریک حاکمیت اور فرماں روائی بھی ہے۔ قرآن حکیم میں اس صفت کا اتنی وضاحت سے اور اتنی بار حوالہ دیا گیا ہے کہ کوئی عالم و مفسر تو کیا، ایک عام آدمی بھی اس سے ناواقف نہیں رہ سکتا۔ لیکن اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ واقفیت بالعموم اجمالی ہی ہوتی ہے اور جب سوال اس کے تفصیلی علم اور گہری واقفیت کا سامنے آتا ہے تو پھر صورت واقعہ ویسی نہیں رہ جاتی جیسی ہونی چاہیے، اور اس عظیم صفت کی صحیح معرفت رکھنے والے بہت تھوڑے رہ جاتے ہیں۔

اوپر کی سطروں میں اس صفت حاکمیت کو ایک عظیم ترین اور اہم ترین صفت کہا گیا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ صرف بجائے خود ہی ایک اہم صفت نہیں ہے بلکہ کتنی ہی اساسات دین کا سرچشمہ بھی ہے۔ ان اساسات دین میں رسالت اور معاد جیسے بنیادی اصول دین بھی شامل ہیں۔ اگر اللہ جل شانہ کی اس صفت کو سامنے نہ رکھا جائے تو شریعت، بالخصوص غیر تعبدی احکام دین کی

کوئی مضبوط اور واضح بنیاد پائی ہی نہ جا سکے گی۔ حالانکہ یہ عظیم بنیادی صفت اپنے عمل، واثر کے لحاظ سے صرف تشریع ہی کے معاملے میں فیصلہ کن حیثیت نہیں رکھتی بلکہ دنیا کے احوال ووقائع اور قوموں کے عروج وزوال کے پیچھے بھی اسی کی جلوہ سامانیاں کارفرما رہتی ہیں۔ اس لیے اگر اس صفت کو ٹھیک طور سے نہ سمجھا گیا تو حق بات یہ ہے کہ پھر صرف دین ہی کو نہیں دنیا کو بھی صحیح طور سے نہیں سمجھا جا سکتا۔

یہ اللہ تعالیٰ کا امت مرحومہ پر ایک خصوصی فضل ہے کہ وہ حق وصواب سے نہ کبھی کلیۃً بے بہرہ ہوسکی نہ ہو سکے گی۔ چنانچہ اس امر خاص میں بھی آپ دیکھیں گے کہ ایک عام غفلت اور کم آگہی کے باوجود امت میں ایسے صاحبِ نظر علماء ہمیشہ موجود رہے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ کی صفات کا متوازن علم اور اس کی صفت حاکمیت کا صحیح ادراک حاصل تھا۔ انہی مردان حق آگاہ میں مولانا حمید الدین فراہیؒ بھی تھے، اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ دین کے اس اہم مسئلہ کی طرف انہوں نے جو توجہ کی ہے اور اس اہم صفت خداوندی کی جس طرح نقاب کشائی کی ہے اس کی نظیر بہت کم مل سکے گی۔ چنانچہ انہوں نے اس موضوع پر ایک مستقل تصنیف بھی چھوڑی ہے، تا کہ اس صفت کی وہ اہمیت اچھی طرح واضح ہو جائے جس کی وہ فی الواقع حامل ہے۔ اس کتاب کی ابتدا میں انہوں نے یہ شکوہ بھی کیا کہ ہمارے علماء نے دین کے اس اہم ترین موضوع پر اور اس صفت کے معانی و مطالب اور مقتضیات کی توضیح وتبیین پر وہ توجہ نہیں فرمائی جس کی ضرورت تھی۔ یہ سعادت خاص انہیں اس لیے ارزانی ہوسکی کہ انہیں نہ صرف فہم قرآن کا غیر معمولی ملکہ عطا ہوا تھا بلکہ وہ قلب خاشع بھی ملا تھا جو بجائے خود نزول کتاب، کا پوری طرح اہل تھا وہ قرآن حکیم کی گہرائیوں میں بالکل یکسو ہو کر اور سارے پیشگی خیالات، ذاتی رجحانات اور تقلیدی ذوق سے ذہن کو پاک رکھ کر اترتے تھے اور اللہ کی اس کتاب کو بنیادی طور خود اسی کے نظائر وشواہد کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کرتے تھے۔ اس اہتمام اور التزام کا ثمرہ یہ ہوتا کہ وہ دین کے مختلف پہلوؤں میں سے کسی کی طرف زیادہ جھک پڑنے اور کسی کا پورا حق نہ ادا کر سکنے کی اس غلطی سے محفوظ رہے جس میں لوگ عام طور سے مبتلا ہو جایا کرتے ہیں۔ اللہ کی صفت حاکمیت کے باب میں وہ جن حقائق تک پہنچے وہ دراصل ان کی اسی گہری قرآن فہمی کا اور دین کے اس صحیح، جامع اور متوازن تصور کا فیضان تھا جو

اس قرآن فہمی کے نتیجے میں انہیں حاصل ہو سکا تھا۔

ان کی مذکورہ بالا بیش قیمت کتاب صفت حاکمیت کے بارے میں جن اہم نکات پر مشتمل ہے ان کا صحیح اندازہ اس کتاب کے عمیق مطالعے ہی سے ہو سکتا ہے۔ یہاں اس کے چند مشتملات کا تذکرہ کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

مولانا صفت حاکمیت کی اہمیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ان عظیم ترین اور اہم ترین دینی معارف میں سے، جن کے بغیر نہ توحید کا عقیدہ ٹھیک رہ سکتا ہے نہ دین حق کی صحیح واقفیت حاصل ہو سکتی ہے، نہ انسان کی عقل کو طمانیت حاصل ہو سکتی ہے۔ نہ اس کے قلب کو وہ علم ومعرفت بھی ہے جس کی طرف قرآن نے ہماری رہ نمائی فرما رکھی ہے اور جسے عقیدۂ توحید کا ہم نشین قرار دیا ہے اور یہ ہے اللہ تعالیٰ کی صفت حاکمیت اور اس کے عدل کا علم۔ الخ'' (ص:٦)

دوسری جگہ فرماتے ہیں :

''یاد رکھو اللہ تعالیٰ اور اس کی ساری ہی صفات کمال کی معرفت ہی سارے علوم دین کا اصل سرچشمہ ہے۔ ان سب صفات میں سب سے اہم صفت اس کی لاشریک حاکمیت کی صفت ہے'' (ص:۴)

صفت حاکمیت کی صحیح معرفت کے ثمرات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

''اس معرفت کے طفیل دنیا کی تاریخ کا اور دین کی تاریخ کا، احکام وشرائع کا اور ان کی حکمتوں کا اور ان کے دلائل کا سیاست الہیہ سے مطابقت رکھنے والی اعلیٰ و افضل سیاست مملکت کا'....... سب کچھ کا سمجھ لینا آسان ہو جاتا ہے۔'' (ص:۴، ۵)

صفت حاکمیت کے معانی و مقتضیات بیان کرتے ہوئے خلافت کے بارے میں فرماتے ہیں:

''چونکہ خلافت نام ہے اس بات کا کہ لوگوں کو ایک متحدہ ہیئت میں پرو دیا جائے، یہاں تک کہ وہ سب کے سب ایک دل ودماغ سے کام لینے لگیں..... اور اس کے نتیجہ میں ان کے مصالح کو فروغ اور ان کی قوتوں کو استحکام حاصل ہو، ان کی آزادی محفوظ

رہے، ان کا کلمہ بلند ہو، ان کے اخلاق ترقی کرتے جائیں، ان کی برکتوں کا دائرہ وسیع ہو جائے تا کہ ان کا وجود خلق کے لیے رحمت اور زمین پر باعث برکت بن جائے۔ اس لیے یہ خلافت ان کے لیے سب سے بڑا خیر اور سب سے بڑی نعمت ثابت ہوتی ہے۔ جب حقیقت یہ ہے تو ان کے لیے بالکل ضروری ہے کہ اس خلافت کے قیام و بقا کے لیے اپنی ساری کوششیں صرف کر ڈالیں، یہی ان کی زندگی کا نصب العین اور ان کی آرزوؤں کا مرکز ومحور ہے۔'' (ص: ۳۰، ۳۱)

اس گراں قدر کتاب کے صرف چند اہم گوشوں کو یہاں روشنی میں لا سکا ہوں۔ میرا خیر خواہانہ مشورہ ہے کہ اہل علم اس کتاب کا پورے اہتمام اور پورے تعمق سے تفصیلی مطالعہ کریں، تا کہ اس کے مندرجات سے پوری طرح واقف ہو سکیں۔

مولانا محمد فاروق خاں

مولانا حمید الدین فراہیؒ اور حکمتِ قرآن

حکمت کی تعلیم فرائض نبوت میں سے ایک اہم فریضہ رہا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:

رَبَّنَا وَابۡعَثۡ فِيۡهِمۡ رَسُوۡلًا مِّنۡهُمۡ يَتۡلُوۡا عَلَيۡهِمۡ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الۡكِتٰبَ وَالۡحِكۡمَةَ وَيُزَكِّيۡهِمۡ ؕ اِنَّكَ اَنۡتَ الۡعَزِيۡزُ الۡحَكِيۡمُ ﴿۱۲۹﴾

(البقرہ:۱۲۹)

''اے ہمارے رب! تو ان میں انہیں میں سے ایک رسول مبعوث فرما جو انہیں تیری آیات پڑھ کر سنائے اور انہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دے اور ان کا تزکیہ کرے۔ بے شک تو غالب حکمت والا ہے۔''

حکمت کے بغیر دین حق کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ نہیں کیا جاسکتا اور نہ اس کے بغیر نظام دین کی فکری و عملی شیرازہ بندی کی جاسکتی ہے۔ حکمت کے بغیر صحیح معنی میں تزکیہ کا حصول بھی ممکن نہیں ہے جو دین کی اصل غرض وغایت ہے۔ اس دنیا کی اور آخرت میں جنت کی زینت وہی اشخاص ہیں جو نہایت پاک باز، حساس اور فہم وادراک میں امتیازی شان رکھتے ہیں۔ امت مسلمہ میں جو عملی اور فکری انتشار اور بے راہ روی پائی جاتی ہے اس کا حقیقی سبب اس حکمت کا فقدان ہے جو حقیقت میں دین کی روحِ حیات ہے۔ حصول حکمت کے بغیر نہ تو دین کا صحیح فہم حاصل ہوسکتا ہے اور نہ یہ ممکن ہے کہ اس کے بغیر کوئی صحیح معنی میں راہ جنت پر گامزن ہوسکے۔

حکمت کی اس بنیادی اہمیت کے باوجود اسلامی لٹریچر میں ایسی کتابیں نایاب نظر آتی ہیں جن میں حکمت پر مفصل اور اطمینان بخش گفتگو کی گئی ہو۔ اور یہ بتایا گیا ہو کہ حکمت فی الواقع کیا چیز ہے؟ اس کی خصوصیات کیا ہیں؟ قرآن مجید میں جہاں کہیں حکمت کا ذکر کیا گیا ہے اس مقام سے بالعموم لوگ بے توجہی کے ساتھ گزر جاتے ہیں اور انہیں اس کی خبر تک نہیں ہوتی کہ وہ کس چیز کو نظر انداز کر رہے ہیں۔

امام حمید الدین فراہیؒ نے قرآنی علوم کو اپنی توجہ کا خاص مرکز بنایا تھا۔ اس سلسلے میں ان کی تحقیقات نہایت قدر و قیمت کی حامل ہیں۔ امام فراہیؒ نے اپنے فکر و تدبر سے قرآن فہمی کی راہ ہموار کی۔ یہ ان کا وہ عظیم کارنامہ ہے جسے فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن افسوس کہ ان کی تحقیقات کی قدر شناسی سے ہم قاصر ہی رہے۔ ان کی تصنیف ''حکمۃ القرآن'' کا اردو ترجمہ بھی منظر عام پر اس وقت آیا جب کہ امام فراہیؒ کو وفات پائے ایک طویل عرصہ گزر چکا ہے۔ ایسا بھی نہیں کہ حکمت قرآن کے موضوع پر تحقیقی کتابیں پہلے سے موجود رہی ہوں اس لیے اس کتاب کی اشاعت کی غیر معمولی تاخیر میں کوئی خاص حرج محسوس نہیں کیا گیا۔

امام فراہیؒ حکمت قرآن اور اس کے مختلف پہلوؤں پر اپنے نتائج فکر کو مفصل لکھنے کا ارادہ رکھتے تھے، افسوس کہ یہ اہم کام ناتمام رہا۔ پھر بھی جو کچھ وہ لکھ سکے ہیں وہ نہایت ہی بیش قیمت ہے۔ مسرت کی بات ہے کہ محترم خالد مسعود نے حکمۃ القرآن اور النظام فی الدراسۃ الاسلامیہ کے مسودے کو مرتب شکل دے کر اسے اردو زبان میں منتقل کر دیا۔ موصوف نے اس کتاب میں بطور مقدمہ اپنا جو مقالہ شامل کیا ہے وہ بھی نہایت کارآمد ہے اور وہ اصل کتاب کے سمجھنے میں معاون ہوگا۔

اللہ تعالیٰ نے خود قرآن کو بلند اور حکمت سے لبریز کتاب قرار دیا ہے۔ (الزخرف: ۱۳) اس کا تقاضا ہے کہ ہم اس کتاب کی حکمتوں تک پہنچنے کی سعی کریں۔ اور اس میں کسی قسم کی کوتاہی کو روا نہ رکھیں۔ حکمت سے مراد کیا ہے؟ اس کی کیا خصوصیات ہیں اور اس کی پہچان کیسے ہو؟ حکمت کی ضرورت اور اس کی اہمیت کیا ہے؟ حکمت کو پوشیدہ رکھنے کا راز کیا ہے؟ اس کے حصول کے ذرائع کیا ہیں؟ وہ کون سے لوگ ہیں جنھیں حکمت کی دولت عطا ہوتی ہے۔ حکمت کی نشوونما کے

شرائط کیا ہیں؟ حصول حکمت کی راہ کی رکاوٹیں کیا ہیں؟ وغیرہ مباحث پر امام فراہیؒ نے جو گفتگو کی ہے ضرورت ہے کہ اسے سمجھنے کی پوری کوشش کی جائے اور پھر اس سے پورا فائدہ اٹھایا جائے۔ امام فراہیؒ کی یہ مختصر سی کتاب ان لوگوں کے لیے ایک رہ نما کتاب ہے جو فی الواقع دین اور حکمتِ قرآن کو سنجیدگی سے سمجھنے کے خواہش مند ہوں۔

امام فراہیؒ کے نزدیک حکمت کوئی منطقی نگاہ ہرگز نہیں ہے، بلکہ یہ راست اور بے واسطہ ادراک ہے، جیسے کوئی شخص کسی چیز کو چکھ لے اور اس کی لذت کو اپنی باریک اور نازک ترین حسیات سے پہچان لے اور اس سے لطف اندوز ہو۔ حکمت کی روشنی میں حقائق کے چہروں سے پردے خود بخود ہٹ جاتے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح دن کی روشنی رات کی تاریکی میں چھپی ہوئی چیزوں کو بالکل نمایاں کر دیتی ہے۔

حکمت کیا ہے؟ حکمت اکتسابی علوم کا نتیجہ نہیں ہوتی۔ بلکہ وہ ایک ایسی روشنی ہے جس سے خیر وشر اور حسن و قبح اجاگر ہو جاتے ہیں۔ حکمت کو ایک کیفیت اور حالت سے موسوم کیا جاسکتا ہے۔ صاحب حکمت کے سامنے کوئی مسئلہ آتا ہے تو اس کے ہر پہلو کا ادراک اسے بعینہٖ اسی طرح ہو جاتا ہے، جس طرح ایک آدمی چکھ کر تلخ اور شیریں شے میں فرق کرتا ہے۔ حکمت سے ایسے خزانوں کا در وا ہوتا ہے جن کی کوئی انتہا نہیں۔

امام فراہیؒ کے نزدیک جب کسی شخص کو حکمت کی دولت عطا ہوتی ہے تو یہ حکمت اس کے قول وعمل، ذوق وارادہ، فیصلہ غرض ہر چیز سے ظاہر ہوتی ہے۔ حکمت حقیقت میں علم وعمل دونوں کی جامع ہوتی ہے۔ یہ جس کسی کو حاصل ہوگی اس کا اخلاق کریمانہ ہوگا۔ رذائل اخلاق سے وہ یکسر پاک ہوگا۔ اس کی روح اعلیٰ اقدار حیات سے تسکین پاتی ہے۔ آخرت کی وسیع و پائیدار دنیا اس کے لیے ایک عقیدے کا موضوع نہیں ہوتی بلکہ وہ اس کی حکمت کا عین تقاضا ہوتی ہے۔ پھر حکمت مختلف ومتضاد چیزوں کو ایک کل کی شکل میں بدل دیتی ہے۔ اس طرح آدمی ذہن وعمل کے انتشار سے نجات پالیتا ہے۔ وہ ایک مستحکم فکر وعمل کا حامل بن جاتا ہے۔ اس طرح حکمت ہماری ایک اہم اور بنیادی ضرورت ثابت ہوتی ہے۔ خاص طور سے وہ لوگ جو قیادت کے منصب پر ہوں، حکمت دین سے بے خبر اور نا آشنا رہ کر وہ کبھی بھی امت کے اندر اتحاد واتفاق پیدا نہیں کر سکتے

اور نہ اسے فکری انتشار سے نجات دلا کر منزل کی طرف اس کی صحیح رہ نمائی کر سکتے ہیں۔

امام فراہیؒ نے لکھا ہے کہ حکمت کو پانے اور اسے نشوونما دینے کے لیے ضروری ہے کہ ہمارا علم محض علم نہ رہے۔ بلکہ ہم اس کے نتیجہ میں عمل صالح کے پیکر بن جائیں۔ حکمت عطا کرنے والے خدا کی حمد کریں اور اس کا شکر بجالائیں۔ شکرِ نعمت اضافۂ نعمت کا سبب ہوتا ہے۔

ہمارے دل خشوع کی صفت سے خالی نہ ہوں کیونکہ خشوع وہ دروازہ ہے جس کے ذریعہ سے حکمت دل میں داخل ہوتی ہے۔ بات یہ ہے کہ خشیت اور تقویٰ کے ذریعہ سے دل میں صفائی آتی ہے اور اس کے اندر یہ صلاحیت پیدا ہوتی ہے کہ وہ حکمت کے نور کو قبول کر سکے۔

حکمت کو عام نگاہوں سے پوشیدہ رکھا گیا ہے۔ اس کے کئی وجوہ ہیں۔ امام فراہیؒ فرماتے ہیں کہ حکمت کی حقیقت بالتدریج حاصل ہوا کرتی ہے۔ یہ یکبارگی حاصل نہیں ہوتی۔ انسانی قلب حکمت کو ایک ہی مرتبہ میں اٹھالے اس کی اس میں طاقت نہیں ہے۔ اس کے علاوہ حکمت کے پوشیدہ رکھنے کی ایک اہم وجہ یہ بھی ہے کہ اگر حکمت ظاہر ہوتی تو اس کا اندیشہ تھا کہ عام لوگ اس کا انکار کر دیتے اور مجرم قرار پاتے۔ پھر حکمت خود اس بات کی مقتضی ہے کہ اسے صرف ان ہی لوگوں پر ظاہر کیا جائے جو بلندی کے طالب اور پاکیزہ اخلاق کے حامل ہوں۔ دوسروں سے اسے مخفی رکھا جائے۔ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو حکمت ضائع ہو کر رہ جاتی۔ نااہل قدر شناس نہیں ہوسکتا۔ اور نہ اس کے دل میں جذبۂ شکر کے لیے کوئی جگہ ہوتی ہے۔ پھر حکمت کوئی ایسی مادی چیز نہیں ہے جو لوگوں کے درمیان تقسیم کی جاسکے۔ اور اس طرح سامنے لائی جاسکے کہ ہر ایک پر وہ ظاہر اور عیاں ہو۔ حکمت خدا کا تازہ اور نقد انعام ہوتا ہے۔ وہ کوئی ایسی چیز نہیں ہوتی جو فرسودہ ہو اور جس کے ساتھ کہنگی کا عیب لگا ہو۔ حکمت القا ہوتی ہے۔ حکمت ایک الہامی ادراک اور حقائق کا بلا واسطہ مشاہدہ ہے۔ یہ ایک وجدانی اور زندہ شے ہے۔ ظاہر نہیں کی جاتی۔ جو اس کے اہل ہوتے ہیں ان پر خود بخود ظاہر ہو جاتی ہے ہے۔

حصول حکمت کے ذرائع کیا ہیں؟ امام فراہیؒ کے نزدیک اس سلسلے میں پہلی چیز اللہ تعالیٰ کی طرف ایسی توجہ ہے جو انتہائی خشیت، عاجزی اور محبت کے ساتھ ہو، نصف شب کی نماز کو اس میں خاص اہمیت حاصل ہے۔ دوسری چیز ہے قرآن کی تلاوت جو ٹھہر ٹھہر کر اور غور وفکر کے ساتھ ہو۔

پھراس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ مخلوق خدا کے ساتھ ہمارا رویّہ رحمت وشفقت اور خیر خواہی کا ہو۔اس کے بغیر اچھی صفات سے ہمارا متصف ہونا ممکن نہیں ہے۔

حصول حکمت کی رکاوٹیں کئی ہیں۔ایک بڑی رکاوٹ یہ چیز ثابت ہوئی ہے کہ لوگوں نے حکمت سے کچھ ایسی چیزیں مراد لے لی ہیں جو فی الواقع حکمت نہ بنیں اور وہ ان ہی پر قانع ہوکر رہ گئے۔

امام فراہیؒ کی کتاب ،حکمت قرآن لائق مطالعہ ہی نہیں بلکہ یہ ایسی تصنیف ہے جو بار بار پڑھنے کی ہے۔اس سے ہمارے علم میں ہی اضافہ نہ ہوگا بلکہ شاید ہمیں اپنے اندر کسی کمی کا احساس ہوجائے اور ہم اس کی تلافی کی فکر کرسکیں۔

مولانا رضوان احمد اصلاحی

حدیث وسنت کی حقیقت
افکار فراہیؒ کی روشنی میں

حدیث وسنت کتاب اللہ کے بعد اسلامی شریعت کے سب سے اہم اور بنیادی ماخذ ہیں۔ محدثینِ کرام نے نبی کریم ﷺ کے اقوال وافعال اور تصویب کی حفاظت کا اہتمام جس بیدار مغزی کے ساتھ کیا ہے یہ امت کے لیے سرمایۂ افتخار ہی نہیں بلکہ یہ ایک ایسا منفرد کارنامہ ہے جس کی نظیر پیش کرنے سے تاریخ انسانیت قاصر ہے۔ لیکن اس کے باوجود یہ ایک حقیقت ہے کہ تمام کتب حدیث کا تحقیقی معیار یکساں نہیں، اور چونکہ سنت وحدیث کا تعلق دین اسلام کی اساسیات سے ہے اس لیے کسی بھی قول وعمل اور تصویب کا انتساب اللہ کے رسولؐ کی طرف کرنا نہایت نازک معاملہ ہے۔ چونکہ حدیث کے مقبول ہونے کی واحد کسوٹی اصول روایت کو قرار دے دیا گیا ہے اور اصول درایت سے عموماً صرف نظر کیا گیا ہے۔ نیز تدوین حدیث کے بعد بھی متن کی قبولیت اور اس سے استدلال کی کسوٹی روایت ہی قرار پائی اور درایت پر کوئی خاص توجہ نہیں دی گئی حتیٰ کہ اختلاف کی صورت میں توجہ کا تمام تر مرکز تشریحات وتعلیقات رہیں، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اصول حدیث کی اصطلاحات کی معنویت ہی ختم ہو کر رہ گئی اور عام مسلمانوں کا یہ رجحان بن گیا کہ ہر وہ خبر جو "حدثنا" اور "اخبرنا" کے ساتھ آئے کل کی کل قابل قبول ہے اور کسی کو اس کے سلسلے میں لب کشائی کی اجازت نہیں جس کے نتیجے میں امت کے درمیان دین کا غلط تصور برپا ہو گیا

اور احادیث کی تحقیق کے سلسلے میں جمود پیدا ہو گیا۔ اصول کے باب میں پرانے تقلیدی رجحان کو ختم کر کے اسے متوازن انداز میں پیش کرنے کی سب سے بڑی کوشش علامہ فراہیؒ نے اپنی کتاب ''احکام الاصول باحکام الرسول'' میں کی ہے۔ اس سے ہرگز یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ امام فراہیؒ سے پہلے کسی نے اس طرف اعتنا ہی نہیں کیا۔ ہر دور میں ایسے علماء کی ایک تعداد موجود رہی ہے جس نے اس رجحان پر تنقیدی نظر ڈالی ہے لیکن امام فراہیؒ کے کام کی نوعیت بالکل منفرد ہے۔

اخذ وقبول روایت کے سلسلے میں علمائے امت کے اندر تقلید جامد بلکہ اندھی تقلید کا جو رجحان پیدا ہو گیا تھا اس نے اسرائیلیات اور موضوعات تک کو قرآن پر حکم بنا کر رکھ دیا تھا۔ ظاہر ہے اس صورت حال سے امام فراہیؒ جیسا قرآن کا فدائی اور سنت کا شیدائی کیسے چین کی نیند سو سکتا تھا۔ چنانچہ انہوں نے پوری جرأت کے ساتھ اس ذہن کے خلاف آواز اٹھائی اور حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر بن خطابؓ کی یاد تازہ کردی۔ امام صاحب کی جرأت سے ایوان تقلید جامد میں زلزلہ آ گیا اور ہر طرف سے انکار حدیث کے فتوؤں کی بارش شروع ہوگئی۔ مگر کچھ ایسے سنجیدہ نفوس بھی تھے جنہوں نے اس طوفان میں امام فراہیؒ کے اس فکر کا دفاع کیا۔ بلاخوف لومۃ لائم اس حق کا ساتھ دیا۔ ان سعید نفوس میں علامہ شبلی نعمانیؒ، مولانا حسین احمد مدنیؒ اور علامہ سید سلیمان ندویؒ کے نام خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔

شریعت اسلامی کے مآخذ تین ہیں: ۱۔ قرآن مجید، ۲۔ سنت ثابتہ، ۳۔ حدیث۔

قرآن مجید

صحائف آسمانی میں اس کی حیثیت آخری ایڈیشن کی ہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اس کو فرقان یعنی حق و باطل کی کسوٹی قرار دیا ہے۔ چنانچہ ہمارا عقیدہ ہے کہ کسی بھی چیز کے ردوقبول کا آخری معیار قرآن مجید ہے۔

سنت ثابتہ سے ہماری مراد رسول اللہ ﷺ کا وہ عمل متواتر ہے جو تعامل صحابہؓ کے ذریعہ ہم تک پہنچا ہے، لیکن سنت ثابتہ اور احادیث کو بالعموم علمائے اصولیین نے مترادف قرار دیا ہے۔ جس کی وجہ سے دونوں میں التباس پیدا ہو گیا ہے اور اس سے ایک فکری گمراہی کا دروازہ کھل گیا ہے۔ چنانچہ امام فراہی لکھتے ہیں:

”ایک اور قابل لحاظ حقیقت یہ ہے کہ قرآن سے جو کچھ ثابت ہو اس میں اور فروع سے جو کچھ معلوم ہو اس میں فرق کرنا چاہیے، دونوں کو خلط ملط نہیں کرنا چاہیے۔ کیوں کہ قرآن میں جو کچھ ہے وہ قطعی ثابت ہے اور فروع میں وہم وظن کے لیے بہت کچھ گنجائش ہے۔“(۱)

احادیث وسنت کی بنیاد قرآن مجید

یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ رسول اکرمؐ کی اطاعت اسی طرح واجب ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کی۔ آپؐ بحیثیت معلم شریعت ایک کامل نمونہ تھے اور یہی آپ کے فرض منصبی کا عین تقاضا بھی تھا۔ چنانچہ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۱۶۴﴾ (آل عمران: ۱۶۴)

”واقعی اللہ نے اہل ایمان پر یہ بڑا احسان فرمایا کہ ان میں ان ہی میں سے ایک ایسا رسول برپا کیا جو انہیں اس کی آیتیں سناتا ہے، ان کا تزکیہ کرتا ہے اور ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے ورنہ اس سے پہلے یہ لوگ صریح گمراہی میں پڑے ہوئے تھے۔“

دوسری جگہ ارشاد ہے:

وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۚ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۷﴾ (الحشر: ۷)

”جو کچھ رسول تمہیں دے وہ لے لو اور جس سے روکے اس سے رک جاؤ اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ بے شک اللہ تعالیٰ سخت سزا دینے والا ہے۔“

ان آیات کے مطالعہ کے بعد سنت کے ماخذِ شریعت ہونے کا انکار دراصل قرآن کا انکار ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی زندگی قرآن کی چلتی پھرتی تصویر تھی۔ چنانچہ حضرت عائشہؓ کا بہت مشہور قول ہے: کان خلقہُ القرآن۔

احادیث وسنت کا بنیادی فرق

سنت عملی تواتر کے ذریعہ بحیثیت دین اس امت تک منتقل ہوئی ہے۔ ثبوت کے اعتبار سے اس میں اور قرآن میں کوئی فرق نہیں اس لیے کہ جس طرح قرآن کریم قولی تواتر کے ساتھ مروی ہے اسی طرح سنت عملی تواتر سے مروی ہے لیکن احادیث زیادہ تر اخبار آحاد کے طریق سے ہم تک پہنچی ہیں اس لیے اگر یہ قرآن وسنت اور عقل وفطرت سے ہم آہنگ ہوں اور کسی بھی جہت سے اس کے خلاف نہ ہوں اور قابل اعتماد ذرائع سے ہم تک پہنچیں تو ان کی حجیت بھی مسلم ہے۔

سنت کا تعلق عملی تواتر سے ہے جو بہ اجماع صحابہؓ ہم تک منتقل ہوئی ہے۔ جب کہ حدیث کا حال یہ ہے کہ اس میں آپ کی سنت کی مرویات کے علاوہ تقریر وتصویب، سیر ومغازی، قصص انبیاء، تفسیر قرآن، شان نزول، تاریخ اور مناقب وفضائل وغیرہ ایسی چیزیں بھی شامل ہیں جنہیں سنت کا نام نہیں دیا جاسکتا۔ چنانچہ یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ حدیث، سنت سے الگ ایک چیز ہے۔ نیز امت تک دونوں کے منتقل ہونے میں بڑا فرق ہے۔ ایک عملی تواتر سے پہنچا ہے تو دوسرا خبر واحد کے ذریعہ، جس کی دلالت کے ظنی ہونے پر بالعموم سب کا اتفاق ہے اور امت کے اکابر نے بھی حدیث کو سنت متواترہ سے الگ ایک چیز سمجھا ہے اور اسے تیسرا ماخذ قرار دیا ہے۔ چنانچہ حضرت ابوبکرؓ کا یہ قول منقول ہے:

> كان ابوبكر اذا ورد عليه الخصم نظر فى كتاب الله فان وجد فيه ما يقضى بينهم قضى به وان لم يكن فى الكتاب وعلم من رسول الله ﷺ فى ذلك الامر سنة قضى بها فان اعياه خرج فسأل المسلمين وقال :أتانى كذاو كذا۔ (۴)

> ''حضرت ابوبکر صدیقؓ کے سامنے جب کوئی قانونی معاملہ آتا تو وہ قرآن حکیم میں اس کا حل تلاش کرتے، وہاں نہ ملتا تو سنت کی طرف رجوع کرتے اور اگر سنت میں بھی نہ ملتا تو لوگوں سے دریافت کرتے کہ اس معاملہ میں رسول اللہؐ کے فیصلے کا کسی کو علم ہے؟ بسا اوقات صحابہ میں سے کچھ لوگ بتادیتے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس معاملہ میں یہ فیصلہ فرمایا ہے۔''

چنانچہ خلیفۂ راشد کے خیالات ہمارے لیے سنت کے مقام کو متعین کرنے کے سلسلے میں نشان راہ کی حیثیت رکھتے ہیں لیکن علماء کرام نے حدیث وسنت کو عام طور سے مترادف استعمال کیا ہے جس کی وجہ سے بعد میں آنے والوں کا عام خیال یہ ہو گیا ہے کہ حدیث وسنت ایک ہی چیز ہے ان کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔ حالانکہ الفاظ کا ایک دوسرے کے ہم معنیٰ کے طور پر استعمال ہونا زبان کے عام اصول کے موافق ہوتا ہے، سنت کا لفظ حدیث کے لیے اس لیے مستعمل ہے کہ احادیث کی بیشتر مرویات رسول اکرمؐ کی سنت مطہرہ پر مشتمل ہیں اس بنا پر سنت کا لفظ علی السبیل التغلیب حدیث کا مترادف ہے لیکن جب زبان میں لفظ کا عام استعمال مترادف کے طور پر استعمال ہونے لگے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ جن چیزوں کے لیے یہ لفظ بولا جا رہا ہے وہ بھی معنوی اعتبار سے ایک ہی ہو گئی ہے اور ان کے درمیان کوئی فرق باقی نہیں رہا۔ مثلاً نبی اور رسول کا لفظ بھی ایک دوسرے کے مترادف کے طور پر مستعمل ہے لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں ہے کہ اس کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے جب کہ پوری امت اس کے درمیان فرق کی قائل ہے۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ قرآن مجید نے بھی ان لفظوں کو مترادف کے طور پر استعمال کیا ہے اس لیے اس میں کوئی تفریق نہیں ہوسکتی ان کی یہ بات درست نہیں سمجھی جائے گی۔ کیونکہ زبان کے عام اصول کی رو سے بلاشبہ حدیث وسنت بسا اوقات علی السبیل التغلیب مترادف کے طور پر استعمال ہوتے ہیں لیکن اس سے حدیث وسنت کا باہمی امتیاز ختم نہیں ہو جاتا۔ ائمۂ کبار بھی ان لفظوں کو ہم معنی استعمال کرنے کے باوجود تفریق کے قائل رہے ہیں۔

امام مالکؒ کی رائے

علاّمہ ابن رشدؒ رفع یدین کے سلسلے میں امام مالکؒ کا مسلک بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> فمنهم من اقتصر به على الاحرام فقط ترجيحا لحديث عبد الله بن مسعود و حديث البراء بن عاذب وهو مذهب مالك لموافقة العمل به۔ (۵)

''فقہاء میں سے وہ بھی ہیں جنہوں نے رفع یدین کو صرف تکبیر تحریمہ کے ساتھ عبداللہ بن مسعود اور براء بن عاذب کی روایت کو ترجیح دینے پر خاص کر دیا ہے۔ یہی رائے امام مالکؒ کی ہے اس لیے کہ ''العمل بہ'' سے اس کی تائید ہوتی ہے۔''

عام طور سے علماء کا خیال ہے کہ رفع یدین کی روایات متواتر ہیں۔ ان کو امام مالک نے ''العمل بہ'' یعنی سنت کی کسوٹی پر رکھ کر اسے تکبیر تحریمہ کے ساتھ مخصوص کر دیا اور آغاز ہی میں ابن رشدؒ نے ان کا یہ اصولی موقف ظاہر کر دیا۔

السبب فی هذا الاختلاف كله اختلاف الآثار الـوارد ة فی ذلک ومخالفة العمل بالمد ينة بعضها۔ (۲)

''اس اختلاف کی تمام تر وجہ اس باب میں وارد آثار کا باہمی اختلاف اور اہل مدینہ کے عمل کا ان بعض آثار سے مختلف ہونا ہے۔''

یہاں روایات کے عمل اہل مدینہ سے متعارض ہو جانے پر امام موصوف نے عمل متواتر کو ترجیح دی۔

امام شافعیؒ کی رائے

امام ممدوح اپنی معرکۃ الآراء کتاب ''الرسالہ'' میں لکھتے ہیں:

تختلف الاحاديث فآخذ ببعضها استد لالا بكتاب او سنة او اجماع او قياس۔ (۷)

''احادیث باہم مختلف بھی ہوتی ہیں، تو میں ان میں سے کچھ کو قرآن سنت یا اجماع یا قیاس سے استدلال کر کے ترجیح دے لیتا ہوں۔''

اگر امام شافعیؒ کے نزدیک حدیث وسنت ایک ہی چیز ہوتی تو مختلف احادیث کو ترجیح دینے کے باب میں سنت کو معیار نہ بناتے کیونکہ سنت کی دلالت امام موصوف کے نزدیک یقینی ہے اور حدیث کی دلالت یقینی نہیں۔ دوسری جگہ امام صاحب ''باب الاختلاف فی الحد'' کے تحت اجماع اور قیاس کے باب میں رقم طراز ہیں:

نحكم بالكتاب والسنة المجتمع عليها التى لا اختلاف فيها فنقول لهذا حكمنا با لحق فى الظاهر والباطن و نحكم بسنة رويت من طريق الانفراد لا يجتمع الناس عليها فنقول حكمنا با لحق فى الظاهر لانه قد يمكن الغلط فيمن روى الحديث۔ (۸)

''اجماع اور قیاس کے معاملہ میں قرآن مجید اور ایسی مجمع علیہ سنت سے جس میں اختلاف نہیں پایا جاتا ہم استدلال کرتے ہیں۔ اس اجماع اور قیاس کے بارے میں کہیں گے کہ ہم نے اس حق سے استدلال کیا ہے جو ظاہر و باطن میں حق ہے اور اس سنت سے بھی استدلال کیا ہے احادیث باہم مختلف بھی ہوتی ہیں، تو میں ان میں سے کچھ کو قرآن سنت یا اجماع یا قیاس سے استدلال کر کے ترجیح دے لیتا ہوں۔ جو خبر آحاد کے طور پر آتی ہے اور وہ مجمع علیہ نہیں ہے اس کو ہم یہ کہیں گے کہ ہم نے ظاہری طور پر حق ہی سے حجت پکڑی ہے کیونکہ جس نے حدیث روایت کی ہے اس سے غلطی بھی ہو سکتی ہے۔''

مذکورہ بالا عبارت سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ جس حدیث کو امام شافعیؒ سنت کا مترادف قرار دے رہے ہیں اسے انہوں نے سنت سے الگ حیثیت دی ہے اور دونوں کا نام بھی یکساں نہیں رکھا۔ ایک کو انہوں نے ''السنة المجتمع عليها'' کہا ہے اور دوسری کو ''السنة قد رويت من طريق الانفراد'' کہا ہے، چنانچہ یہ بات واضح ہوگئی کہ امام موصوف سنت اور حدیث کے درمیان تفریق کے قائل ہیں۔

صاحب الکفایۃ کی رائے

امام خطیب بغدادیؒ صحت اور عدم صحت کے لحاظ سے روایات کی تقسیم کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ويستدل ايضا على صحته بان يكون خبرا عن امر اقتضاه القرآن او السنة المتواترةاو اجتمعت الأمة على تصديقه(۹)

''روایت کی صحت تک اس طرح بھی پہنچا جا سکتا ہے کہ حدیث کسی ایسے معاملہ کی

اطلاع دے جو اقتضائے قرآن یا اقتضائے سنت متواترہ کے مطابق ہو یا امت اس کی
تصدیق پر جمع ہوگئی ہو۔''

مذکورہ بالا عبارت سے یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ خطیب بغدادیؒ بھی تفریق کے قائل ہیں۔ نیز ''اجتمعت الامة علیٰ تصدیقه'' سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اجماع امت کے خلاف کوئی حدیث قابل قبول نہیں ہوگی اور میرے خیال سے ٹھیک یہی بات سنت متواترہ کے بارے میں کہی جاسکتی ہے۔ کتاب کے آخر میں انہوں نے 'ذکر ما یقبل فیه خبر الواحد ومالا یقبل فیه'' کے نام سے ایک باب باندھا ہے، جس میں وہ رقم طراز ہیں :

لا یقبل خبر الواحد فی منافات العقل وحکم القرآن والسنة المعلومة والعقل الجاری مجریٰ سنة وکل دلیل مقطوع به۔(۱۰)

''وہ حدیث قبول نہیں کی جائے گی جو عقل، حکم قرآن، حکم سنت معلومہ اور سنت جاریہ کی کسی دلیل قطعی کے منافی ہو۔''

یہ نقطۂ نظر ہمارے ان اسلاف کا ہے جن کو علوم حدیث کے باب میں صاحب البیت کی حیثیت حاصل ہے، وہ ان دونوں کو باہم مترادف بولنے کے باوجود اس میں امتیاز کے قائل رہے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حدیث اپنے مندرجات اور ثبوت کے تئیں ہم تک پہنچنے کے اعتبار سے سنت سے یکسر مختلف ہے۔ امام فراہیؒ کا خیال بھی علمائے سلف کے عین مطابق ہے۔ چنانچہ آپ نے مؤطا پر جو حاشیہ چڑھایا ہے اس سے آپ کے اس نقطۂ نظر کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔

امام فراہیؒ تحریر فرماتے ہیں:

سنت سلف متصل است تا پیغمبر متواتر است اخبار آحاد محتمل صدق وکذب و خطاء فهم تبدیل در ادائے خبر ست و طریق امام مالک و ابو حنیفه اعتماد بر سنت است که زمان تابعین را دریا فته بودند، بعد ازاں سنت خود تغیر یافت و اعتماد علماء براخبار و روایات باقی ماند۔(۱۱)

''سلف کی سنت پیغمبر تک متصل اور متواتر ہے۔ اخبار آحاد میں صدق و کذب دونوں کا

احتمال ہے۔اس میں فہم کی خطا اور بات کو ادا کرنے میں کوتاہی کا امکان ہے۔امام مالک اور امام ابوحنیفہ کا طریقہ سنت کے باب میں اعتماد کا ہے کیونکہ انہوں نے تابعین کا زمانہ پایا ہے، بعد ازاں سنت کا مفہوم تبدیل ہو گیا اور علماء کا اعتماد اخبار وروایات پر ہی باقی رہا۔''

لیکن امام فراہیؒ قرآن وسنت کی تفریق کے رجحان کے سخت مخالف تھے۔احکام الاصول میں ایک جگہ رقم طراز ہیں:

''رسول اللہ ﷺ کا حکم یکساں طور سے پر از حکمت ہوتا ہے خواہ وہ کتاب اللہ کی بنیاد پر ہو یا اس نور وحکمت کے مطابق ہو جس سے خدا نے آپ کا سینہ بھر دیا تھا۔'' (۱۲)

امام فراہیؒ کا خیال ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کی حفاظت فرمائی ہے اسی طرح سنت کی بالخصوص شرعی اصطلاحات کی بھی حفاظت فرمائی ہے۔مقدمہ ''نظام القرآن'' میں فرماتے ہیں:

''اسی طرح تمام اصطلاحات شرعیہ مثلاً نماز، زکوۃ، جہاد، روزہ، حج، مسجد حرام، صفا، مروہ اور مناسک حج وغیرہ اور ان کے ساتھ جو اعمال متعلق ہیں تواتر اور توارث کے ساتھ سلف سے خلف تک سب محفوظ رہے ہیں، ان میں جو معمولی یا جزوی اختلافات نظر آتے ہیں وہ بالکل نا قابل لحاظ ہیں۔شیر کا معنی ہر شخص کو معلوم ہے اگر چہ مختلف ممالک کے شیروں کی شکلوں اور صورتوں میں کچھ نہ کچھ اختلاف ہے، اسی طرح جو نماز دین میں مطلوب ہے وہ وہی نماز ہے جو مسلمان پڑھتے ہیں ہر چند کہ اس کی ہیئت میں بعض جزئی اختلافات ہیں۔جو لوگ اس طرح کی چیزوں میں زیادہ کرید اور موشگافی سے کام لیتے ہیں وہ اس دین فطرت کے مزاج سے بالکل ناواقف ہیں جس کی تعلیم قرآن پاک نے دی ہے۔'' (۱۳)

سنت کی نوعیت اور اس کی حیثیت

سنت قرآن سے الگ کوئی ایک مستقل ماخذ شریعت نہیں ہے بلکہ اس کی حیثیت قرآن

کی ہی تفسیر، توضیح اور تشریح کی ہے، اس لیے کتاب وسنت میں کہیں کوئی تصادم نہیں۔ چنانچہ فن اصول حدیث کی شہرۂ آفاق کتاب ''الموافقات'' کے مصنف شاطبیؒ فرماتے ہیں:

فلا تجد فی السنة أمرا الا القرآن قد دل علی معناه دلالة اجمالية أو تفصيلية۔ (۱۴)

''تم سنت میں کوئی حکم نہیں پاؤ گے۔ مگر یہ کہ قرآن مجید نے اس کے معنی اجمالاً یا تفصیلاً کھول دیے ہیں۔''

اس کے برخلاف بے شمار ایسی حدیثیں ہیں جو نہ صرف یہ کہ قرآنی تعلیمات سے میل نہیں کھاتیں بلکہ وہ قرآن سے صریح متصادم ہیں۔ اسی لیے محدثین نے اصول مقرر فرمایا ہے کہ جب کوئی روایت اللہ کے رسول ﷺ کی طرف منسوب ہو تو اس کی تحقیق ضروری ہے اور تحقیق میں جہاں اس کی سند کا جائزہ لینا ضروری ہے وہیں نفس مضمون پر بھی تدبر لازم ہے کہ مبادا کوئی ایسی چیز رسولؐ کی طرف منسوب ہو جائے جو رسولؐ کی نہ ہو۔ اب اگر تحقیق کے بعد یہ معلوم ہو جائے کہ واقعی یہ فرمان رسولؐ یا عمل رسولؐ ہے تو اس کی تعمیل امت پر ہر حال میں واجب ہوتی ہے۔

البتہ بعض امور ایسے بھی ہیں جن کا ذکر قرآن نے نہیں کیا ہے تو ان میں نبی کریمؐ نے اجتہاد سے کام لیا ہے اور نبی کا اجتہاد دیگر لوگوں کے اجتہاد سے یکسر مختلف رہتا ہے۔ کیونکہ نبی گناہوں سے معصوم اور نفسانی خواہشات سے محفوظ رکھا گیا ہے۔ اس لیے اس کا اجتہاد مزاجِ شریعت سے متعارض نہیں ہو سکتا اور اللہ تعالیٰ نے نبی کے لیے اجتہاد کی گنجائش اس لیے باقی رکھی کہ اس کا اجتہاد دراصل امت کے اندر اجتہاد کی صلاحیت پیدا کرنے اور ذوق اجتہاد کو پروان چڑھانے کے لیے ہوتا ہے۔ چنانچہ رسول کے طریقۂ اجتہاد کی حکمت پر روشنی ڈالتے ہوئے امام فراہیؒ لکھتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ نے نبی کو شریعت کی تعلیم کے لیے مبعوث فرمایا تو حکمت اور اسرار شریعت کی تعلیم بھی آپ کے فرائض منصبی میں داخل کر دی تا کہ امت اجتہاد کے قابل ہو سکے، اپنی عقلوں کو استعمال کرنا سیکھے اور ظاہری و باطنی دلائل سے استدلال کر سکے۔ پس حضورؐ ہمارے لیے کتاب اللہ کی تبیین کرتے تھے تا کہ ہم پر قرآن کے اشارات پر

تفکر و تدبر کا منہاج واضح ہو۔" (۱۵)

اور مقدمہ نظام القرآن میں لکھتے ہیں:

"نبی کی روحِ بیدار خود بھی معروف و منکر کی شناخت کا سرچشمہ ہوتی ہے۔ جن چیزوں کے بارے میں وحی کی رہ نمائی موجود نہیں ان میں وہ اپنے الہام سے امت کو کوئی حکم اس وقت تک کے لیے دیتا ہے جب تک کہ وحی نہ آجائے اور یہ کام اس کے منصب کا قدرتی جز ہوتا ہے۔" (۱۶)

"احکام الاصول" میں امام موصوف نے نبی کی بیدار روح کے فیض کا منبع اس مخصوص نور کو قرار دیا ہے جس کا حوالہ سورۂ شوریٰ میں ہے:

وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ۭ مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَاۗءُ مِنْ عِبَادِنَا ۭ وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۵۲﴾ (الشوریٰ: ۵۲)

"اور اسی طرح ہم نے تمہاری طرف بھی وحی کی ہے ایک روح اپنے امر میں سے۔ نہ تم یہ جانتے تھے کہ کتاب کیا ہے اور نہ جانتے تھے کہ ایمان کیا ہے لیکن ہم نے اس کو ایک نور بنایا جس سے ہم ہدایت دیتے ہیں اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتے ہیں اور بے شک تم ایک سیدھی راہ کی طرف رہ نمائی کر رہے ہو۔"

آگے لکھتے ہیں:

"اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو قرآن مجید کی جہت مکنون کی طرف بھی رہ نمائی فرمائی تھی۔ اس نے اس روح سے نبی کے قلب کو زندگی بخشی اور اس نور کی ہدایت دے کر آپ کو وہ علم بخشا جو آپ کو پہلے حاصل نہ تھا اس لیے آپ نے جو کچھ ارشاد فرمایا اس کو سنت کی مستقل بنیاد سمجھا جائے گا۔

رسول اللہ کا حکم یکساں طور پر پُر از حکمت ہوتا ہے خواہ وہ کتاب کی بنیاد پر ہو یا اس نورِ رحمت کے مطابق جس سے خدا نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا سینہ بھر دیا تھا۔" (۱۸)

ان اقتباسات سے معلوم ہوتا ہے کہ امام موصوف کے نزدیک اولاً رسول کی حیثیت

مبین کی ہے۔ ثانیاً۔ آپ اس نورِ حکمت کے ذریعہ جو اللہ نے آپ کو عطا فرمایا اپنے طور پر بھی احکام دیتے تھے۔ اس نور وحکمت کو ہم اجتہاد نبوی یا الہام سے تعبیر کر سکتے ہیں، یہ سب دراصل سنت نبوی سے ہی عبارت ہے۔

امام فراہیؒ بھی سنت کی تشریعی حیثیت کے اسی طرح قائل ہیں جس طرح دیگر ائمۂ دین۔ چنانچہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''سلف اور ائمہ نے اپنے مذہب کی صحت کی بدولت کتاب اور سنت دونوں کو مضبوطی سے پکڑا۔ یہ نہیں کیا کہ باطل پسندوں اور ملحدوں کی طرح ان میں تفریق کر کے ایک چیز کو ترک کر دیا۔'' (۱۹)

حدیث کی حیثیت

امام فراہیؒ کا خیال حدیث کے تعلق سے یہ ہے کہ وہ فرع کی حیثیت رکھتی ہے اور اصل الاصول کی حیثیت صرف قرآن کو حاصل ہے کیوں کہ قرآن کی صحت ہر قسم کے شک وشبہ سے بالاتر ہے اور یہ بات حدیث کے تعلق سے نہیں کہی جاسکتی، چنانچہ مولانا اپنی تفسیر ''نظام القرآن'' کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

> ''اصل واساس کی حیثیت تو صرف قرآن کو حاصل ہے اس کے سوا کسی چیز کو یہ حیثیت حاصل نہیں ہے۔ باقی فرع کی حیثیت سے تین ہیں: ۱۔ احادیث، ۲۔ قوموں کے ثابت شدہ اور متفق علیہ حالات، ۳۔ گزشتہ انبیاء کے صحیفے۔
>
> اگر احادیث، تاریخ اور قدیم صحیفوں میں ظن اور شبہ کو دخل نہ ہوتا تو ہم ان کو فرع کے درجہ میں نہ رکھتے بلکہ سب کی حیثیت اصل کی قرار پاتی۔'' (۲۰)

آگے مزید فرماتے ہیں:

> ''ایک اور قابل لحاظ حقیقت یہ ہے کہ قرآن سے جو کچھ ثابت ہو اس میں اور فروع سے جو کچھ معلوم ہو اس میں فرق کرنا چاہیے۔ دونوں کو خلط ملط نہیں کرنا چاہیے کیونکہ قرآن مجید میں جو کچھ ہے وہ قطعی ثابت ہے اور فروع میں وہم وظن کے لیے بہت

کچھ گنجائش ہے۔"(۲۱)

ان عبارتوں سے پتہ چلتا ہے کہ امام فراہیؒ سنت کی تشریعی حیثیت کو تو تسلیم کرتے ہیں لیکن احادیث کو وہ درجہ دینے کے لیے تیار نہیں جو عام طور سے متاخرین دیتے ہیں۔ چونکہ اس میں وہم و ظن کا احتمال ہوتا ہے اس لیے اس کی دلالت تمام ائمہ حدیث کے نزدیک ظنی ہے۔ امام بزدویؒ لکھتے ہیں:

> وهكذا نجد نصوص العلماء و المتكلمين والاصوليين مجتمعة علىٰ أن خبر الآحاد لا يفيد اليقين، فلا تثبت به العقيدة ونجد المحققين من العلماء يصفون ذلك بانه ضروری لايصح أن ينازع احد فی شيئ منه (۲۲)

> "اسی طرح ہم تمام متکلمین اور اصولیین کو اس امر پر متفق پاتے ہیں کہ خبر واحد مفید یقین نہیں۔ اس لیے اس سے عقیدہ کا اثبات نہیں کیا جا سکتا ہے اور تمام محقق علماء کے نزدیک یہ ایک امر قطعی ہے۔ اگر کوئی شخص اس میں اختلاف و نزاع پیدا کرتا ہے تو وہ غلطی پر ہے۔"

بسا اوقات امام فراہیؒ ایسی حدیث کو بھی قبول کر لیتے ہیں جو بالعموم محدثین کے نزدیک ضعیف ہوتی ہے۔ ان کے نزدیک اصل قرآن ہے اس لیے وہ اس کی روشنی میں روایات کو پرکھتے ہیں۔ اور اس کے بعد اس کا درجہ متعین کرتے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

> فلا بد أن يوخذ من النقل مع التنقيد والاختيار بما صح و ثبت، ولا يحمل ذلك علىٰ ترك النظر دلالة القرآن وحمل الآية على نظائرها والجمود على المنقول المحض، وعدم الفرق بين صحيحه وسقيمه و تسويته فی الاعتماد، (۲۳)

> "چنانچہ ضروری ہے کہ منقول سے اخذ و استفادہ اس شرط کے ساتھ کیا جائے کہ وہ تنقید کے بعد صحیح قرار پائے اور ثابت شدہ ہو لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ دلالت قرآن اور اس کے نظائر سے صرف نظر کر لیا جائے اور منقول محض پر جمود اختیار کر لیا جائے اور صحیح و سقیم

روایات میں کوئی فرق نہ کیا جائے اور باعتبار اعتماد دونوں کو مساوی درجہ دے دیا جائے۔"

حدیث کا صحیح یا ضعیف قرار دینا ایک خاص امر اجتہادی ہے جو صحیح بھی ہو سکتا ہے اور غلط بھی۔ اس لیے حدیث کو پرکھنے کے سلسلے میں معیار قرآن کو بنانا چاہیے۔ چنانچہ ملا علی قاریؒ لکھتے ہیں:

> لان هذا كله بحسب ما ظهر للمحدثين من حيث النظر الىٰ الاسناد والافلا مطمع فى الاستناد لتجويز العقل ان يكون الصحيح فى نفس الامر موضوعا والموضوع صحيحا۔ (۲۴)

> "یہ وہ امور و احکام ہیں جو روایات کے اسناد پر نظر ڈالنے سے محدثین کو معلوم ہوتے ہیں۔ ورنہ یقین کی کوئی صورت نہیں۔ عقل اس بات کو جائز رکھتی ہے کہ جس کو انہوں نے صحیح کہا وہ فی الحقیقت موضوع ہو اور جس کو موضوع کہا ہے وہ صحیح ہو۔"

امام فراہیؒ نے احکام الاصول میں اس سلسلے میں جو کچھ فرمایا ہے وہ نہایت ہی اہم اور وقیع ہے۔ ہم اس کو یہاں نقل کرتے ہیں:

> "قرآن کی نسبت کے لحاظ سے رسول اللہ ﷺ کے احکام، تین واقعی اور دو فرضی قسموں پر مشتمل ہیں۔ پہلی قسم ان احکام کی ہے جن کے بارے میں حضورؐ نے صراحت فرمائی ہے کہ وہ کتاب اللہ سے مستنبط ہیں۔ حالانکہ ظاہر کتاب کی نص میں وہ حکم موجود نہیں گویا وہ حکم مستنبط ٹھہرا ہے اور حضورؐ کے فرض تبیین کے مطابق ہیں، ان احکام میں اصل و فرع پر غور کر کے ان کے استنباط کا پہلو معلوم کرنا دشوار نہیں ہوتا۔
> دوسری قسم ان احکام کی ہے جن کے متعلق حضورؐ نے خود کوئی صراحت نہیں فرمائی مگر قرآن سے ان کے استنباط کا پہلو کلام کی دلالتوں کے ایک عارف پر ظاہر ہے۔ پس ایک تو یہ حکم قرآن سے ماخوذ ہونے کی بنا پر صحت سے قریب تر ہوتا ہے اور خدا نے نص کتاب کی روشنی میں اپنے رسول کو فیصلہ کرنے کا حکم بھی دیا ہے۔ فرمایا:
>
> اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ ؕ (النساء:۱۰۵)
>
> "ہم نے یہ کتاب تم پر حق کے ساتھ اتاری ہے تاکہ تم لوگوں کے درمیان اس کے مطابق فیصلہ کرو جو اللہ نے تمہیں دکھایا ہے۔"

دوسرے رسول تمام انسانوں سے زیادہ کتاب اللہ کو سمجھنے والے تھے۔ آپ کے لیے یہ کیسے ممکن تھا کہ جس معاملہ کے بعض پہلوؤں کا اشارہ کتاب اللہ میں موجود ہو اس کا کتاب کی روشنی کے بغیر فیصلہ کریں۔

تیسرے عرب قوم کی یہ خصوصیت تھی کہ وہ کلام کے اشارات و کنایات کو خوب سمجھنے والے تھے اور حضورؐ گو چوں کہ نور و ہدایت اور بصیرت خدا کی طرف سے حاصل تھی، اس لیے آپ اس معاملہ میں سب سے زیادہ ذکی تھے۔ احکام کی یہی قسم ثانی ہے جس میں بعض وجوہ استنباط علماء پر مخفی رہ گئے لیکن غور وفکر کر کے آدمی ان تک پہنچ سکتا ہے۔ پس اگر وجوہ استنباط ہم پر واضح ہو جائیں گے تو اصول یہ ہوگا کہ ہم اللہ کی کتاب کو اصل اور سنت کو اس کی فرع قرار دیں گے۔ صحابہؓ کا اس پر اتفاق تھا کہ وہ سب سے پہلے قرآن پر غور کرتے اور جب اس میں کوئی رہ نمائی نہ پاتے تو سنت کی طرف رجوع کرتے اور یہی بات قرین عقل بھی ہے۔ ان احکام کے متعلق ہمارا یقین ہے کہ حضورؐ نے قرآن کے اشارات سے ان کو مستنبط کیا خواہ ان کے وجوہ استنباط ہم پر مدت ہائے دراز تک مخفی رہیں۔

تیسری قسم ان احکام کی ہے جن کے متعلق قرآن کی کوئی نص وارد نہیں البتہ وہ اس اضافہ کا متحمل ہے۔ ایسے احکام میں ہم سنت کو مستقل اصل قرار دیں گے کیوں کہ ہمیں اطاعت رسولؐ کا حکم دیا گیا ہے اور رسولؐ کا حکم یکساں طور پر پُراز حکمت ہوتا ہے خواہ وہ کتاب اللہ کی بنیاد پر ہو یا اس نور و حکمت کے مطابق ہو جس سے خدا نے آپ کا سینہ بھر دیا تھا۔

چوتھی قسم ان احکام پر مبنی ہے جو کتاب اللہ سے زائد ہیں اور کتاب ان کی متحمل نہیں۔

پانچویں قسم ان احکام پر مشتمل ہے جو قرآن کے مخالف ہیں۔ یہ آخری دونوں قسمیں فرضی ہیں، جن کا حقیقت میں کوئی وجود نہیں کیوں کہ ان سے قرآن کا جلی یا خفی نسخ لازم آتا ہے، علماء کے درمیان جو اختلاف ہوا ہے وہ انہی احکام میں ہوا ہے لیکن یہ احکام گنے چنے ہیں۔ اگر ان کے بارے میں کتاب وسنت کے درمیان تطبیق پیدا کی جا سکے تو نزاع ختم ہو سکتی ہے۔ (۲۵)

مندرجہ بالا تفصیلات سے یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ حدیث کی تشریعی حیثیت کے سلسلے

میں جو عام علمائے کرام کا موقف ہے وہ مزید تحقیق طلب ہے۔

سنت اور نسخ قرآن

سنت قرآن کے کسی حکم کو منسوخ کر سکتی ہے یا نہیں؟ یہ ہمیشہ سے علمائے فن کا دلچسپ موضوع رہا ہے۔ امام فراہیؒ سنت کے ناسخ ہونے کے خیال کے سخت مخالف اور ناقد ہیں، سنت کو یہ اختیار نہیں ہے کہ قرآن کے کسی حکم کو منسوخ کرے اور یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ قرآن میں تغیر وتبدل کا اختیار رسول کو نہیں کیوں کہ یہ اختیار نص قطعی سے ثابت نہیں۔ محض قیاس سے سنت کو ناسخ ماننا ایک بے جا جسارت ہے، چنانچہ قرآن کا ارشاد ہے:

قُلۡ مَا يَكُوۡنُ لِيۡۤ اَنۡ اُبَدِّلَهٗ مِنۡ تِلۡقَآئِ نَفۡسِيۡ ۚ اِنۡ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوۡحٰۤى اِلَيَّ ۚ (یونس:۱۵)

"اے نبیؐ! کہہ دو مجھے کیا حق ہے کہ میں اس میں اپنے جی سے ترمیم کردوں میں تو صرف اس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر اترتی ہے۔"

قرآن مجید کی روشنی میں احادیث واخبار کی تحقیق اور اس سے استنباط واستناد کے سلسلے میں امام فراہیؒ نے جو کچھ لکھا ہے وہ نہایت وقیع ہے اور اس کی روشنی میں احادیث کا جائزہ ایک اہم اور وقیع کام ہے جس پر علمائے امت کو توجہ دینی چاہیے تا کہ نقد ونظر کو صحیح رخ مل سکے۔

نیز جن لوگوں کا یہ دعویٰ ہے کہ انہوں نے چمنستان فراہی سے خوشہ چینی کی ہے اور رسائل فراہی کا بغور مطالعہ کیا ہے، اور مطالعہ کی روشنی میں اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ امام فراہیؒ قرآن کے ایک بڑے عالم تو ہیں لیکن ذخیرۂ احادیث پر ان کی نظر نہیں ہے ایسے حضرات سے میری گزارش ہے کہ وہ بغیر کسی خارجی دباؤ کے از سر نو فراہیؒ کی کتابوں کا مطالعہ کر کے رائے قائم کریں۔

مراجع

۱- علّامہ حمید الدین فراہیؒ، ترجمہ تفسیر نظام القرآن، ص: ۴۱، دائرہ حمیدیہ مدرستہ الاصلاح، سرائے میر، اعظم گڑھ۔ ۱۴۱۱ھ مطابق ۱۹۹۰ء

۲- سورہ آل عمران آیت، ۱۶۴

۳- سورہ الحشر آیت، ۷

۴- العلّامہ شاہ ولی اللہ بن عبدالرحیم المحدث الدھلوی، حجۃ اللہ البالغہ الجزء الاول مبحث فی الفرق بین اھل الحدیث واھل الرأی ص ۴۹، کتب خانہ رشیدیہ دہلی۔

۵- محمد بن احمد بن محمد بن احمد رشد القرطبی، بدایۃ المجتھد ونھایۃ المقتصد الجزء الاول ص ۱۳۴

۶- ایضاً ص ۱۳۳

۷- امام شافعی، الرسالہ، باب خبر الواحد ص ۵۲، تجارت الکتب، جالی محلّہ بمبئی ۳ تاریخ طباعت موجود نہیں۔

۸- ایضاً باب الاختلاف فی الحد ص ۸۲

۹- الشیخ العلامہ خطیب بغدادی کتاب الکفایۃ فی علم الروایۃ، باب الکلام فی الاخبار وتقسیمھا، ص ۱۷، تحت ادارہ جمیعۃ دائرۃ المعارف العثمانیہ فی مطبعتھا القائمۃ بلدۃ حیدر آباد الدکن سنۃ ۱۳۵۷ھ

۱۰- ایضاً، باب ذکر مایقبل فیہ خبر الواحد ومالا یقبل فیہ ص ۴۳۲

۱۱- شرح موطا پر مولانا فراہی کا قلمی حاشیہ، بحوالہ علّامہ حمید الدین فراہی: حیات وافکار (مقالات فراہی سیمینار) ص ۲۳۵، دائرۃ حمیدیۃ مدرستۃ الاصلاح سرائے میر۔

۱۲- رسالہ تدبر لاہور، نومبر ۱۹۹۱ء، خالد مسعود ص ۳۲

۱۳- علامہ حمید الدین فراہیؒ، ترجمہ امین احسن اصلاحیؒ تفسیر نظام القرآن مقدمہ ۳ ص ۴۱، دائرہ حمیدیہ مدرستۃ الاصلاح سرائے میر اعظم گڑھ۔

۱۴- الموافقات ۴/ ۱۲ بحوالہ (حیات وافکار) فراہی سیمینار میں شامل مقالہ۔ مولانا فراہیؒ اور تفسیری روایت، ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی کی رائے۔ سنت اور اقوال سلف کے باب میں مولانا فراہیؒ کی رائے کی وضاحت کرتے ہوئے مرتب عبیداللہ فراہی کے حاشیہ سے ماخوذ ہے۔

۱۵- غیر مطبوعہ تصنیف ''احکام الاصول باحکام الرسول'' بحوالہ مقالات فراہی سیمینار، حدیث وسنت کی تحقیق کا فراہی منہاج، خالد مسعود، ص ۲۲۵

۱۶- ترجمہ تفسیر نظام القرآن مقدمہ ۱۱ (معروف ومنکر) ص ۵۹

۱۷- سورہ شوریٰ: ۵۲

۱۸- احکام الاصول باحکام الرسول۔ بحوالہ مقالات فراہی سیمینار خالد مسعود ص ۲۲۶۔

۱۹- ایضاً ص ۲۲۷

۲۰- ترجمہ تفسیر نظام القرآن، مقدمہ (۲) تفسیر کے خبری مآخذ ص ۳۹

۲۱- ایضاً ص ۴۱

۲۲- الاسلام عقیدۃ وشریعۃ ص ۴۷ بحوالہ حیات وافکار۔ مقالات فراہی سیمینار ص ۲۴۳

۲۳- العلامۃ عبد الحمید الفراہیؒ، رسائل الامام الفراہی فی علوم القرآن (التکمیل فی اصول التاویل) ص ۲۱۷۔ الدائرۃ الحمیدیۃ بہ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر اعظم گڑھ، لطبعۃ الثانیۃ ۱۴۱۱ھ

۲۴- الشیخ علی القاری الھروی۔ المصنوع فی معرفۃ الحدیث الموضوع ص ۴۴۔ الناشر مکتب المطبوعات الاسلامیہ۔ حلب، الفرافرۃ۔ جمعیۃ التعلیم اشرعی ۱۹۶۹ء/ ۱۳۸۹ھ

۲۵- احکام الاصول باحکام الرسول بحوالہ رسالہ ''تدبر'' خالد مسعود، نومبر ۱۹۹۱ء۔ ادارہ تدبر قرآن و حدیث لاہور، پاکستان۔ ص ۳۲

۲۶- سورہ یونس: ۱۵

ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی

مولانا حمید الدین فراہی
اور
مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

اب سے کچھ دنوں پہلے اگر یہ عنوان میری نظر سے گزرتا تو میں حیرت و استعجاب کا اظہار کیے بغیر نہ رہتا لیکن آج میں خود اس پر کچھ لکھنے کے لیے قلم اٹھا رہا ہوں۔ آج بھی میں اس قابل نہ ہوتا اگر مجھے ادارۂ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد کی طرف سے ''مولانا فراہیؒ کی حیات و خدمات'' پر تلاش و تحقیق کا منصوبہ تفویض نہ کیا گیا ہوتا۔ منصوبے کی رسمی کارروائی اور منظوری کے بعد میں نے اس راہ میں جو سب سے پہلا قدم اٹھایا، وہ ہندوستان و پاکستان کے مشاہیر اہل علم و اصحاب قلم کو خطوط لکھنا تھا۔ میں نے جن اشخاص کو خطوط لکھے ان میں ''مودودی برادران'' بھی تھے۔ مولانا ابوالخیر صاحب نے اپنی روایتی سستی کی وجہ سے میرے خط کا جواب نہیں دیا اور سید مودودی بھی عدیم الفرصتی اور بیماری کی وجہ سے ان دنوں معذور سے تھے اور خود نہ لکھ سکتے تھے۔ رسید اور رسمی جواب کے لیے انہوں نے میرا خط اپنے معاون ملک غلام علی کو دیا جو طاقِ نسیان کی زینت بن گیا۔ یہ بات ملک صاحب نے مجھے خود بتائی۔ ان حضرات کو خطوط لکھنے کا مقصد اس وقت فقط اس قدر تھا کہ کسی طرح کام کی ابتدا ہو اور رہ نمائی کے لیے راہ ہموار ہو۔ اس کے کچھ عرصہ بعد ہی میں نے لاہور کا سفر کیا۔ اس وقت تک میں اپنے مقالے کا باقاعدہ خاکہ وغیرہ مرتب کر چکا تھا۔ خاکہ کے

سوانحی حصہ میں ایک باب ''تلامذۂ فراہی'' کا بھی تھا۔ اور اس وقت تک اس باب کے لیے میرے سامنے صرف دو ہی شخصیتیں تھیں: مولانا اختر احسن اصلاحی مرحوم اور مولانا امین احسن اصلاحی مدظلہ العالی، جن سے میں مدرسۃ الاصلاح کی نسبت اور تعلق سے بہت پہلے سے واقف تھا۔ اور اس وقت تک میرا اندازہ یہی تھا کہ گوشہ نشین فراہیؒ کے تلامذہ کی فہرست میں اور اضافہ کیا ہوگا۔ لیکن مولانا ابوالخیر مودودی کی زبان سے جب میں نے پہلی بار یہ سنا کہ ''ابوالاعلیٰ مودودی بھی مولانا فراہیؒ کے شاگرد رہ چکے ہیں'' تو میں نے واقعتاً اس پر ایک خوش گوار حیرت کا اظہار کیا۔ حیرت اس لیے کہ میرے لیے یہ بہر حال ایک نئی بات تھی جو انکشاف کا درجہ رکھتی تھی۔ میں نے یہی محسوس کیا کہ ابوالخیر صاحب کے کہنے کے مطابق اگر سید مودودی کو مولانا فراہی سے شرف تلمذ حاصل ہوا ہے تو تلامذۂ فراہی کی فہرست میں یہ یقیناً ایک گراں قدر اضافہ ہوگا۔ اس وقت میں نے اس بات کو فقط ایک مفروضے (Hypothesis) کے طور پر تسلیم کرلیا اور تحقیق کے لیے اس کا دروازہ کھلا رکھا۔ پہلی ملاقات میں ابوالخیر صاحب کی زبانی مجھے اتنا ہی معلوم ہو سکا کہ مولانا فراہی جس زمانے میں دارالعلوم حیدر آباد دکن کے پرنسپل تھے سید مودودی اس دارالعلوم کے طالب علم تھے۔ یہ بات اتنی مبہم تھی کہ محض اس کی بنیاد پر کوئی قطعی حکم لگانا یا حتمی رائے قائم کرنا ممکن نہ تھا۔

منصوبہ تفویض ہونے کے بعد مولانا ابوالخیر صاحب سے میری پہلی ملاقات ۲۶ر دسمبر ۱۹۷۷ء کو ان کی جائے رہائش پر ہوئی۔ مولانا رحمٰن پورہ اور ماڈل ٹاون کی رہائش کے بعد اچھرہ میں اٹھ آئے تھے۔ سید مودودی کی جائے قیام ۵۔ اے ذیلدار پارک کے قریب ہی ابوالخیر مودودی ۱۔ اے ذیلدار پارک کی بالائی منزل میں اقامت گزیں تھے۔

ابوالخیر صاحب سے ایک ماہ بعد میری پھر ملاقات ہوئی۔ اس ملاقات میں مولانا فراہی کے حوالے سے پھر اس روایت کا ذکر آیا۔ اس ملاقات کی ایک یادداشت جو میں نے اسی وقت قلم بند کرلی تھی، درج ذیل ہے۔

مولانا ابوالخیر مودودی کا بیان

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے بڑے بھائی مولانا ابوالخیر مودودی نے بیان کیا کہ ابوالاعلیٰ مولانا فراہی کے شاگرد رہ چکے ہیں۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جس زمانے میں مولانا فراہی

دار العلوم حیدر آباد دکن کے پرنسپل تھے، مولانا مودودی دار العلوم میں مولوی عالم سال اول میں داخل ہوئے۔ یہ تعلق چھ ماہ سے زیادہ جاری نہ رہ سکا۔ مولانا مودودی کے والد پر انہی دنوں فالج کا حملہ ہوا جس کے بعد وہ واپس بلا لیے گئے۔ ابوالخیر صاحب نے اس تعلق کو تلمذ سے تعبیر کیا۔ لیکن یہ درست نہیں۔ تلمذ کے لیے ضروری ہے کہ براہ راست استفادہ کی نوبت آئی ہو۔ اولاً تو یہ بھی محل نظر ہے کہ مولانا فراہی پرنسپل کی حیثیت سے دار العلوم کے طلبہ کو پڑھاتے بھی تھے۔ پڑھاتے رہے بھی ہوں گے تو بھی اوپر کی کلاسوں کو، نہ کہ ابتدائی جماعتوں کو۔ مولانا مودودی دار العلوم میں مولوی عالم کی پہلی جماعت میں داخل ہوئے تھے۔ مولوی تک ان کی تعلیم اورنگ آباد کے مقامی مدرسہ میں ہوئی تھی۔ جس کے ایک استاد سے مولانا مودودی کے والد کے ذاتی تعلقات تھے اور اسی تعلق کی وجہ سے انہوں نے ابوالاعلیٰ صاحب کو ان کے مدرسہ میں داخل کرادیا تھا۔ جہاں سے انہوں نے مولوی کا امتحان پاس کیا۔ ابوالاعلیٰ مودودی دار العلوم میں کب داخل ہوئے، تاریخ کا تعین یہاں رہ کر ممکن نہیں۔ ابوالخیر صاحب نے حساب لگا کر بتایا کہ یہ ۱۹۱۴ء کی بات ہوگی اس لیے کہ ۱۹۱۵ء میں ان کے والد پر فالج کا حملہ ہوا اور والد کی اس بیماری ہی کی وجہ سے انہیں واپس بلایا گیا تھا۔

میرے ذوق جستجو کو مولانا ابوالخیر صاحب کے اس ریمارک نے مہمیز کیا کہ ”ابوالاعلیٰ بتائیں گے نہیں۔“ مولانا ابوالخیر صاحب کی یہ بات مطلق میری سمجھ میں نہ آئی۔ ابوالخیر صاحب کے اس ریمارک میں جہاں سید مودودی کے متعلق بلا وجہ کی بدگمانی تھی وہاں مولانا فراہیؒ کے لیے تنقیص بھی تھی۔ میرے نزدیک یہ تو ممکن تھا کہ جس نوعیت کے تعلق کو ابوالخیر صاحب نے تلمذ سے تعبیر کیا اس کو کوئی دوسرا شخص یا خود سید مودودی تلمذ تصور نہ کریں، یہ نقطۂ نظر اور انداز گفتگو کا اختلاف ہوا، لیکن میرا ذہن کسی طور یہ باور کرنے کے لیے تیار نہ تھا کہ سید مودودی کسی غلط داعیۂ نفس کے زیر اثر اس تعلق سے انکار کریں گے۔ میں نے ابوالخیر صاحب سے بحث کی اور اپنے اس عزم کا اظہار کیا کہ میں اب سید مودودی سے ضرور مل کر دریافت کروں گا۔

مولانا مودودی سے ملاقات

اس کے بعد مسلسل سید مودودی کی صحت خراب رہنے لگی۔ میں اس دوران کئی بار لاہور

آیا اور ان سے ملنے گیا۔ مگر اکثر تو ملاقات ہی نہ ہو سکی۔ تکلیف زیادہ تھی۔ ڈاکٹروں نے ملاقات سے منع کر رکھا تھا۔ اور ایک آدھ بار ملاقات ہوئی بھی تو میں نے اس طرح کے مسائل کو چھیڑنا مناسب نہ سمجھا۔ مجھے ملاقات کی اجازت اس شرط پر ملتی تھی کہ میں ایک آدھ منٹ میں صرف ملاقات اور مزاج پرسی پر اکتفا کروں گا۔ اس انتظار میں کہ صحت کچھ بہتر ہو تو اس مسئلے پر گفتگو کروں، کئی مہینے گزر گئے۔ بالآخر ۳؍ مارچ ۱۹۷۸ء کو ایک بار پھر مجھے ملنے کا موقع ملا۔ اس مرتبہ بھی ان کی صحت کچھ بہتر نہ تھی۔ مجھے بمشکل دو تین منٹ ملے ہوں گے۔ میں نے زبردستی کر کے سید مودودی کے سامنے مسئلہ رکھ ہی دیا۔ جواب میں انہوں نے جو کچھ فرمایا میں نے اسی وقت قلم بند کر لیا۔ میں نے حالت بیماری میں تکلیف دہی کے لیے معذرت چاہی اور تفصیلی ملاقات کو آئندہ کے لیے ملتوی کر کے چلا آیا۔ مگر قدرت کو یہ منظور نہ تھا۔ قضا و قدر نے دوبارہ ملاقات کی نوبت ہی نہ آنے دی۔ مجھے جہاں اس کا افسوس ہے کہ دوبارہ مل کر تفصیلات معلوم نہ کر سکا وہاں اس کی خوشی بھی ہے کہ طبیعت کی ناسازی کے باوجود میں نے سید مودودی کی اپنی زبان سے اس مسئلے کی نسبت دو چار جملے خود سن لیے۔ سید مودودی زندہ ہوتے تو میں مزید گفتگو اور تنقیح کے بغیر ان جملوں کو نذر قارئین نہ کرتا۔ لیکن سید موصوف کی وفات کے بعد مسئلہ زیر بحث کی نسبت ان کے فرمائے ہوئے یہ چند جملے اب تاریخ کا حصہ ہیں اور ان کو جتنی جلد محفوظ کر دیا جائے بہتر ہے۔ اس واقعے کو چار برس ہو چکے ہیں۔ کسی کا حافظہ کتنا ہی اچھا ہو قید کتابت کی بات ہی اور ہے۔ ملاحظہ ہو نقل مطابق اصل :

> ''۱۹۱۴ء یا ۱۹۱۵ء کی بات ہے۔ جنگ عظیم ثانی شروع ہو چکی تھی۔ میری عمر بہ مشکل ۱۴۔ ۱۵ برس ہو گی۔ مولانا فراہی دار العلوم کے صدر مدرس تھے۔ وہ عربی ادب کے اسباق بھی پڑھاتے تھے اور مجھے ان کے اسباق میں شرکت کا شرف حاصل ہے۔ اس وقت میری عمر اتنی نہیں تھی کہ میں ان کے مقام کو سمجھ سکتا۔ مولانا نے کہا کہ میرے لیے یہ فخر کی بات ہے کہ مجھے ان سے پڑھنے کا موقع ملا۔''

سید مودودی سے میں نے ان کا سنہ پیدائش بھی معلوم کیا تا کہ یہ متعین ہو سکے کہ اس وقت ان کی عمر کیا تھی۔ اگر ۱۹۰۳ء کی پیدائش ہے تو دار العلوم میں داخلے کے وقت ان کی عمر ۱۲ برس سے زیادہ نہیں ہو سکتی۔

اس ملاقات میں دو قابل ذکر باتوں کے متعلق میری یادداشت یہ ہے:

''تقسیم سے پہلے کی بات ہے مولانا مودودی نے مدرسۃ الاصلاح کا Visit کیا۔ انہوں نے مولانا اختر احسن اصلاحی کے بارے میں بہت اچھے تاثرات کا اظہار کیا۔''

میرے لیے سید مودودی کے یہ چند جملے نئی دنیا کی دریافت سے کم نہ تھے۔ اس میں ذوق آگہی کی تسکین کے علاوہ لذت تحقیق بھی تھی۔ ابوالخیر مودودی کے اندیشے غلط ثابت ہوئے اور میرا خیال درست نکلا۔ سید مودودیؒ نے تکلیف اور بیماری کے باوجود چند مختصر جملوں میں میری الجھن رفع کر دی۔ مولانا فراہیؒ سے ان کے تعلق کی جتنی بات مولانا ابوالخیر نے بتائی تھی اس کی پوری پوری تصدیق ہوگئی۔ لیکن اس سے پیدا ہونے والے اور بہت سے سوالات جو ہنوز تحقیق طلب ہیں، نہیں معلوم اب کوئی شخص ان سے پردہ اٹھا سکے گا یا نہیں۔

مزید تلاش و تفحص

اس ملاقات کے بعد سید مودودی سے دوبارہ ملنے کا موقع نہ ملا لیکن ان کے علاوہ دوسرے کئی واقف حال اشخاص سے میں وقتاً فوقتاً اس مسئلہ پر تبادلۂ خیال کرتا رہا اور مفید باتیں لکھ کر رکھتا گیا۔ اور کچھ مزید باتیں مطالعے سے بھی معلوم ہوئیں۔ چونکہ یہ باتیں اس مسئلے سے متعلق ہیں اور ان سے موضوع زیر بحث کے کسی نہ کسی پہلو پر روشنی پڑتی ہے اس لیے ان کا ذکر کر دینا نامناسب نہ ہوگا۔ اس ضمن میں سب سے پہلے مولانا ابوالخیر صاحب کے ایک مضمون کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

''مولوی کے امتحان سے فارغ ہونے کے بعد ابوالاعلیٰ کو مولوی عالم میں داخل کرنے کے لیے دارالعلوم حیدرآباد بھیج دیا گیا۔ ۱۹۱۵ء میں والد صاحب پر فالج کا حملہ ہوا۔ ابوالاعلیٰ کو تعلیم چھوڑ کر فوراً بھوپال آنا پڑا۔ اس وقت ابوالاعلیٰ کی عمر بارہ سال تھی اور میری پندرہ۔''

مولانا فراہی کا قیام حیدرآباد میں دارالعلوم کے پرنسپل یا صدر مدرس کی حیثیت ۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۹ء بتایا جاتا ہے۔ ان کا سنہ ولادت ۱۲۸۰ھ جو مطابق ہے ۱۸۶۳ء کے۔ درجہ عالم میں سید مودودی کے داخلے کے وقت مولانا فراہی کی عمر پچاس سال سے متجاوز ہو چکی تھی۔ ان کے فکر

کے نتائج متعارف ہو چکے تھے۔ یہی نہیں معلوم کہ وہ دارالعلوم میں عربی ادب کے علاوہ اور کیا پڑھاتے تھے۔ خاص کر قرآن مجید کا کوئی پیریڈ بھی وہ لیتے تھے یا نہیں۔ دارالعلوم کے باہر حیدرآباد میں ان کا درس قرآن ہوتا تھا لیکن اس میں سید مودودی کی شرکت اس لیے خارج از بحث ہے کہ اس وقت ان کی عمر بہت چھوٹی تھی اور اس درس میں صرف بڑے ہی شریک ہوتے تھے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حیدرآباد دکن میں دارالعلوم کی طالب علمی کے اس تعلق کو جو چند مہینے عربی ادب کے اسباق پڑھنے تک محدود ہے، ہم رشتہ تلمذ سے تعبیر کر سکتے ہیں یا نہیں۔ اس ضمن میں جہاں تک ایک سرسری عام بیان کا تعلق ہے اس سے انکار بداہت کا انکار ہوگا۔ لیکن ساتھ ہی یہ حقیقت بھی پیش نظر رکھنی چاہیے کہ یہ تعلق ایک بارہ برس کے طالب علم کا ایک ایسے استاد کے ساتھ ہے جو اس ادارے کے صدر مدرس تھے جس میں وہ کچھ دنوں زیر تعلیم رہا۔ اور تعلق بھی عربی ادب کی تعلیم تک محدود رہا۔ اس لیے فراہی مکتب فکر یا فکر فراہی سے وابستگی کے لیے میرے خیال میں اس تعلق کو کوئی تاریخی اہمیت حاصل ہو تو ہو، کہ بہر حال وہ تعلق کے سلسلۂ ارتقاء کی پہلی کڑی ہے، لیکن اس سے زیادہ اس کو اہمیت دینا حقیقت پسندانہ رویے کے خلاف اور حد سے تجاوز کرنے کے مترادف ہوگا۔

مولوی نجم الدین اصلاحی کا نقطۂ نظر

اصلاحی برادری کے ایک رکن مولوی نجم الدین اصلاحی نے ایک جگہ ایسی بات لکھ دی ہے جو تحقیق اور احتیاط کے منافی ہے۔ وہ اپنے ایک مضمون ''استاد امام مولانا حمید الدین فراہی'' میں سید مودودی کے اس تعلق کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں :

> ''سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب، مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم وغیرہ نے حیدرآباد ہی میں اپنے اپنے ظرف کے مطابق علوم قرآن میں استفادہ کیا۔''

مولوی صاحب موصوف نے یہ نہیں بتایا کہ ان کا ماخذ یا ذریعہ علم کیا ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ انہوں نے زبان زدِ عام روایت پر اکتفا کیا اور قیاس سے کام لے کر یہ لکھ دیا کہ مولانا مودودی نے حیدرآباد میں مولانا فراہی سے علوم قرآن میں استفادہ کیا۔ ہاں اگر کہیں سے یہ

ثابت ہو جائے کہ دار العلوم کے درسی استفادہ کے علاوہ جس کا رقبہ اور حدود اربعہ خود سید مودودی کی تصریحات سے متعین ہو جاتا ہے، دار العلوم کے طالب علم ابو الاعلیٰ نے اپنے ذاتی شعور اور ذوق آگہی اور قرآنی شغف کی بدولت مولانا فراہی سے قرآنی علوم میں استفادہ کا خود اہتمام کیا ہو تو اس بیان کا کوئی وزن ہو سکتا ہے اور اسے درخور اعتنا قرار دیا جا سکتا ہے، ورنہ نہیں۔

بعد کے دور میں ذہنی وفکری تعلق

حیدر آباد میں شاگردی استادی کے اس چند روزہ رسمی تعلق کے بعد اگر ورق یہیں تمام ہو جاتا تو آگے وسعت بیان کی کوئی گنجائش نہ رہ جاتی۔ اور سید مودودی کے لیے ہم اس کا ذکر تبرکاً کر لیتے تو اس میں کوئی مضائقہ بھی نہ ہوتا، لیکن یہ کوئی معتد بہ قابل ذکر بات نہ ہوتی۔ قرائن اور شواہد سے اندازہ ہوتا ہے کہ بعد کی زندگی کے مختلف ادوار میں سید مودودی کا ذہنی اور فکری تعلق مولانا فراہی کے ساتھ کسی نہ کسی صورت میں قائم رہا۔ اس کے بعد براہ راست استفادہ کی کوئی شہادت ہمیں اب تک نہیں مل سکی، لیکن بالواسطہ استفادہ کے شواہد موجود ہیں اور اغلب ہے کہ مولانا فراہی کی مطبوعہ تصانیف بھی سید مودودی کے زیر مطالعہ آئی ہوں گی۔ سید مودودی کی ذاتی لائبریری کے جائزہ سے اس کا کھوج لگایا جا سکتا ہے کہ مولانا فراہی کی کتنی کتابیں ان کی نظر سے گزریں۔ نیز ان کے قریب رہنے والے ان کے اصحاب بھی اس پر روشنی ڈال سکتے ہیں۔ مجھے خود بھی ان معلومات کی فراہمی کا موقع نہیں ملا۔

بالواسطہ استفادہ

منہاج الدین اصلاحی مالک شرکت پرنٹنگ پریس لاہور راوی ہیں کہ مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی، مولانا اختر احسن اصلاحی (جانشین فراہی) کو خطوط لکھ کر تفسیر کے مشکل مسائل میں مشورے حاصل کیا کرتے تھے۔ مولانا اختر احسن صاحب اکثر انہیں سے جواب لکھواتے تھے۔ منہاج صاحب کا بیان ہے کہ اس قسم کے چار پانچ خطوں کا انہیں علم ہے اور یہ خطوط اندازاً ۴۶، ۴۷۔ ۴۸ کے دوران میں پٹھان کوٹ اور لاہور سے لکھے گئے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ سلسلہ پہلے

بھی رہا ہو اور بعد میں بھی جاری رہا ہو۔ مولانا مودودی کبھی تو مولانا فراہی کے حوالہ سے استفسار کرتے کہ فلاں آیت یا فلاں مسئلے میں مولانا فراہی کا نقطۂ نظر کیا تھا یا خود مولانا اختر احسن صاحب وغیرہ کی رائے معلوم کرتے۔ مولانا اختر احسن صاحب چونکہ مولانا مودودی کی علمی و دینی خدمات کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے اس لیے ان کے خطوط کا جواب اہتمام سے لکھواتے تھے۔ اس مسئلے پر سر دست اس سے زیادہ روشنی نہیں ڈالی جا سکتی۔ اگر ان بزرگوں کی خط و کتابت کہیں سے حاصل ہو جاتی تو افادہ و استفادہ کی نوعیت کا صحیح اندازہ ہوتا۔ میں نے مولانا اختر احسن اصلاحی کے نام سید مودودی کے ان خطوط کو سرائے میر (ضلع اعظم گڑھ) جا کر تلاش کیا مگر مجھے اس میں کامیابی نہیں ہوئی۔

مولانا اختر احسن کے زہد و اتقاء کے بارے میں سید مودودی کے یہ الفاظ قابل ذکر ہیں:

''فی الواقع وہ اس زمانے کے اولیاء اللہ میں سے تھے۔''

بے شک مولانا اختر احسن کا علم قرآن اور تدین، فیضان تھا مولانا فراہی کا۔ ان کی صحبت اور تربیت سے جتنا انہوں نے فائدہ اٹھایا کوئی اور نہ اٹھا سکا۔

کچھ تصدیقی آرا

مولانا مودودی کے رفیق خاص اور معاون ملک غلام علی صاحب نے ایک ملاقات میں اس بات کی تصدیق کی کہ تفسیری مسائل میں مولانا حمید الدین فراہی کا نقطۂ نظر معلوم کرنے کے لیے مولانا مودودی صاحب کی اختر احسن صاحب سے خط و کتابت رہتی تھی۔ مگر ایسی تمام چیزیں تقسیم ہند کی افراتفری میں ضائع ہو گئیں۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ مولانا مودودی اکثر اپنی مجالس میں مولانا فراہی کا ذکر کرتے تھے۔ وہ مولانا کے بہت معترف اور مداح ہیں، اکثر کہتے تھے کہ اگر مولانا زندہ رہتے تو ان سے ہمیں بڑی مدد ملتی۔ انہوں نے جو کام کیا افسوس کہ وہ ناتمام رہا۔ اگر وہ تکمیل کر جاتے تو ہمارا کام بہت آسان ہو جاتا۔ ملک صاحب نے یہ بھی بتایا کہ مولانا مودودی مولانا فراہی کی شاگردی کا ذکر بھی اکثر کرتے رہتے تھے۔

ملک صاحب کے الفاظ نے اگر سید مودودی کا مافی الضمیر ادا کرنے میں کوتاہی نہیں کی تو

فراہی اور مودودی دونوں سے تعلق رکھنے والے اسکالروں کے لیے یہ تحقیق کا ایک ہمت آزما موضوع بن سکتا ہے کہ مولانا فراہی اور سید مودودی کے کام میں اشتراک وامتیاز کا تناسب کیا ہے۔ نیز مولانا فراہی کے نا تمام کام کی تکمیل سید مودودی کے کام سے کس حد تک ہوئی۔

میرے ایک دیرینہ کرم فرما ڈاکٹر محمد ادریس شبلی ندوی نے بھی مولانا فراہی کے بارے میں سید مودودی سے سنی ہوئی بعض باتوں کا ذکر کیا۔ ڈاکٹر صاحب آج کل حیدر آباد سندھ میں سکونت رکھتے ہیں۔ دسمبر ۱۹۸۰ء میں حیدر آباد گیا تو ان سے اتفاقیہ ملاقات ہوگئی۔ ان کے بیان کو میں نے اسی وقت قلم بند کر لیا تھا۔

> ''یہ کوئی ۱۹۴۰ء کی بات ہے، مولانا مودودی مبارک پارک پونچھ روڈ لاہور میں مقیم تھے۔ میں ان سے بیضاوی شریف، مقدمہ ابن خلدون اور طبری پڑھا کرتا تھا۔ سبق کے دوران کبھی کبھی مولانا فراہی کا ذکر آجاتا۔ مولانا بہت احترام کے ساتھ ان کا ذکر فرماتے۔ ایک آدھ بار مولانا فراہی سے استفادہ کا ذکر بھی انہوں نے کیا جس کا موقع انہیں حیدر آباد دکن میں ملا۔ مولانا مودودی، فراہی صاحب کی بہت توصیف کرتے۔ فرماتے کہ قرآن مجید پر ان کی بہت عمیق اور دقیق نظر تھی۔ انہیں اپنے فکر میں اتنا انہماک رہتا کہ خود اپنی خبر نہیں ہوتی تھی۔ حالت یہ ہوتی کہ پاجامے کا ایک پائینچہ اونچا ہے تو دوسرا نیچا۔''

پورے چالیس سال بعد ڈاکٹر صاحب نے یہ باتیں مجھ سے بیان کیں۔ ان کے بیان میں ایسی کوئی بات نہیں جو روایت یا درایت کے اعتبار سے نا قابل قبول ہو۔ میں نے بطور تائید مزید اس کا ذکر شامل کر دیا ہے۔ ایک ہی بات مختلف طریقوں سے اور واسطوں سے معلوم ہو تو وہ زیادہ مؤکد سمجھی جاتی ہے۔

بمقام لاہور جون ۸۱ء کی ایک ملاقات میں میں نے نعیم صدیقی سے بھی پوچھا کہ مولانا مودودی کی عام صحبتوں یا علمی مجلس میں انہوں نے کبھی مولانا فراہی کا ذکر بھی سنا۔ انہوں نے بتایا:

> ''لاہور میں تو نہیں البتہ پٹھان کوٹ میں کبھی کبھی ان کا ذکر خاص درس قرآن کے دوران آجاتا تھا۔ مولانا مودودی اور مولانا اصلاحی دونوں کا درس قرآن ہوتا تھا۔ ہم

لوگ دونوں کے درس میں شریک ہوتے تھے۔ مولانا اصلاحی زیادہ تر کلام عرب سے استشہاد کرتے اور نظم قرآن کی باتیں کرتے۔ ضمناً مولانا فراہی کا ذکر چلتا۔ ان کی یہ باتیں سننے کے بعد ہم لوگ مولانا مودودی سے اس کے بارے میں سوالات کرتے تھے۔ مولانا مودودی کی رائے تھی کہ فراہی صاحب آیات کے درمیان جو نظم ثابت کرتے ہیں اس میں کبھی کبھی کھینچا تانی کا رنگ ہوتا ہے۔ تفسیر کے معروف طریقوں سے انحراف اور حدیث سے کم اعتنائی پر بھی بات ہوتی۔''

نعیم صدیقی کی یہ روایت ''مودودی فراہی تعلق'' کے حوالہ سے بحث ونظر کا ایک نیا دروازہ کھولتی ہے۔ نظم قرآن، تفسیر بالماثور اور اعتناء بالحدیث کے متعلق سید مودودی کی یہ رائے جس کا ذکر نعیم صدیقی نے کیا ہے کوئی نئی بات نہیں۔ یہ وہ مسائل ہیں جو پہلے سے میری نظر میں ہیں اور میں ان سے اپنے تحقیقی منصوبے میں سیر حاصل بحث کروں گا۔ سرِ دست میرے پیشِ نظر صرف اس قدر بات ہے کہ سید مودودی کی یہ رائے جو مجھ تک بہر حال ایک ایسے شخص کے ذریعے پہنچی ہے جو عینی شاہد نہیں، شریک واقعہ ہے، یہ رائے قارئین کے سامنے آجائے۔ میں نے فکر فراہی کے ان پہلوؤں پر ابھی کچھ زیادہ تحقیق نہیں کی ہے، تاہم اب تک کی معلومات کے پیش نظر میرا تاثر یہی ہے کہ مولانا فراہی کی نسبت جو لوگ یہ رائے رکھتے ہیں وہ صحیح نہیں ہے۔ مولانا شبلی تفسیر نظام القرآن خاص طور پر ربط آیات سے متعلق فراہی کی فکری کاوشوں کو ایک عرصہ تک لاحاصل خیال کرتے رہے مگر رفتہ رفتہ سمجھنے لگے تو وہ ان کے قائل ہوتے گئے اور آخر میں تو وہ سراپا داد وتحسین ہو گئے تھے۔ فراہی کے نام شبلی کے خطوط میں اس کا جا بجا ذکر ہے۔ ۳ جون ۱۹۰۵ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں :

> ''تفسیر پر تم کو مبارک باد دیتا ہوں اور تمام مسلمانوں کو تمہارا ممنون ہونا چاہیے۔''

دارالعلوم حیدرآباد دکن کے بعد سید مودودی کو مولانا فراہی سے راست استفادہ کا کوئی موقع نہیں ملا۔ تا آنکہ ۱۹۳۰ء میں مولانا کا انتقال ہو گیا۔ اس کا بھی کوئی پتہ نشان اب تک نہیں ملا کہ مولانا کی زندگی میں ان کی جو کتابیں شائع ہوئیں ان میں سے کوئی کتاب کبھی سید مودودی کی نظر سے بھی گزری اور اسی طرح اس کے برعکس کا بھی۔ ۱۹۳۶ء میں دائرہ حمیدیہ قائم ہوا۔ اور

مولانا امین احسن اصلاحی کی ادارت میں ماہنامہ ''الاصلاح'' جاری ہوا جس کے ذریعے مولانا فراہی کے افکار کی اشاعت کا کام باقاعدہ طور پر شروع ہوا۔ پس وپیش تقریباً یہی زمانہ ہے جب سید مودودی نے دعوت دین کے لیے جماعت قائم کی (۱۹۴۱ء)، ترجمان القرآن نکالا (۱۹۳۴ء) اور تفہیم القرآن کا آغاز کیا (۱۹۴۲ء)، الاصلاح سید مودودی کی نظر سے گزرتا تھا۔ کچھ عرصہ الاصلاح اور ترجمان میں بحث بھی چلی لیکن دونوں کی فکر ونظر میں کوئی بنیادی اختلاف نہ تھا اس لیے ایک وقت آیا کہ ان کی راہیں ایک ہوگئیں۔

ایک اہم واقعہ

۱۹۳۶ء میں مدرستی رقابت اور گروہی منافست کی بدولت مولانا فراہی اور علامہ شبلی پر کفر کے فتوے لگے تو سید مودودی تڑپ اٹھے اور انہوں نے اپنے درد وکرب کا اظہار ترجمان القرآن میں ۲۲ صفحات کا طویل شذرہ لکھ کر کیا۔ بیرون خانہ حمایت اور دفاع میں جتنی تحریریں لکھی گئیں ان میں سب سے زوردار، بے لاگ اور بھرپور تحریر سید مودودی کی تھی۔ اس تحریر کا ایک اقتباس ہم یہاں بدرالدین اصلاحی کے مرتب کردہ کتابچہ ''دوعمدہ مضمون'' سے نقل کرتے ہیں:

> ''ارادہ یہ تھا کہ اس تازہ فتویٰ پر کچھ لکھا جائے جس میں مولانا شبلی نعمانی اور مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کی تکفیر کی گئی ہے۔ مگر دل کے درد اور روح کے الم نے اتنے صفحات اس طویل تقریر سے رنگین کرادیے۔ دراصل وہ اذیت ناقابل بیان ہے جو ہمارے دل کو یہ دیکھ کر ہوئی کہ اسلام کے دو سچے خادموں کو ان کی وفات کے برسوں بعد کافر اور ملحد اور زندیق ٹھہرایا گیا ہے۔ حالانکہ ان میں سے ایک شخص وہ ہے جس نے عمر بھر تاریخ اسلام کی خدمت کی، لاکھوں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے دلوں میں اسلام کی گزشتہ عظمت کا سکہ بٹھایا، جس کی تحریروں سے ہزاروں بدعقیدہ مسلمان خوش عقیدہ ہوگئے، جس نے الفاروق اور سیرۃ النبی لکھ کر تمام امت پر احسان کیا، جس کے دل میں اسلام کا ایسا درد تھا کہ جنگ طرابلس وبلقان کے موقع پر نہ صرف خود تڑپا بلکہ اپنی نظموں اور تقریروں سے لاکھوں مسلمانوں کے دلوں میں غیرت ایمانی کی

تڑپ پیدا کر دی۔ دوسرا شخص وہ ہے جس نے مسلسل چالیس برس تک قرآن مجید کی خدمت کی، جس نے معارف قرآن کی تحقیق میں سیاہ بالوں کو سفید کیا، جس کی تفسیروں سے عرب و عجم کے ہزاروں مسلمانوں میں تدبر فی القرآن کا ذوق پیدا ہوا۔ جس کی تحریروں کا ایک ایک لفظ گواہی دے رہا ہے کہ وہ قرآن کا سچا عاشق ہے اور اس کے لفظ لفظ پر جان نثار کرتا ہے۔ اگر ایسے لوگ بھی مسلمان نہیں تو اس زمین پر ہم مسلمانوں کو کہاں تلاش کریں۔"

(دو عمدہ مضمون۔ بدر الدین اصلاحی۔ مطبع اصلاح سرائے میر نومبر ۱۹۳۶ء ص ۱۲)

سید مودودی کو اپنی تحریک کے لیے اعوان و انصار کی تلاش ہوئی تو ان کی نظر فطری طور پر ان علمی اور دینی مراکز کی طرف بھی اٹھی جہاں سے متبع اور عام کارکن نہیں، کچھ ذہین اور دماغ ملنے کی توقع ہو سکتی تھی۔ سید مودودی دور دراز کا سفر اختیار کر کے فراہی کے خلفاء سے ملنے سرائے میر گئے۔ ظاہر ہے اس سفر کا مقصد محض فراہی کی یادگار مدرسۃ الاصلاح کی زیارت نہ تھا بلکہ فکر فراہی کے اس مرکز سے جوہر قابل کی تلاش تھا۔ اس کا ذکر سب سے پہلے تو میں نے خود سید مودودی کی زبانی سنا۔ اس کے بعد ۱۹۷۹ء میں میں ہندوستان گیا تو مدرسۃ الاصلاح کے معائنہ رجسٹر میں اس کا اندراج دیکھا۔ رجسٹر میں سید مودودی کی ایک تحریر بھی ثبت ہے جو مجھے نقل کر لینی چاہیے تھی لیکن مجھے اس کی اہمیت کا اندازہ اس وقت نہ ہوا۔ مدرسہ میں سید مودودی کی آمد کا مختصر حال چند دن پہلے اتفاق سے رسالہ اصلاح میں مل گیا، ملاحظہ کیجئے:

"اس سہ ماہی میں مدرسہ میں متعدد معزز مہمان تشریف لے آئے، جن میں سے مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی امیر جماعت اسلامی، مولانا عبد اللہ مصری، مولانا سید صبغۃ اللہ بختیاری استاذ تفسیر جامعہ دار السلام، مولانا منظور صاحب نعمانی ایڈیٹر الفرقان اور مولانا عبد الصمد صاحب رحمانی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

مولانا مودودی نے دو روز مدرسہ پر قیام فرمایا۔ اس دوران میں ضلع کے مختلف حصوں اور طبقوں کے اصحاب علم و رائے ان سے ملنے کے لیے آتے رہے اور مولانا ان سے جماعت اسلامی کے مقاصد اور اس کے پروگرام پر تبادلۂ خیال کرتے رہے۔ مختلف

لوگوں نے مختلف قسم کے شکوک وشبہات پیش کیے لیکن مولانا نے سب کو مطمئن کرنے کی کوشش کی اور صبر ومحنت اور قابلیت کی ایک عمدہ مثال پیش کی۔ مدرسہ کے اساتذہ اور طلبہ نے بھی ان کی تحریک کے متعلق ان سے تبادلۂ خیالات اور گفتگوئیں کیں۔ ان کی باتوں کی صداقت کا لوگوں پر بہت گہرا اثر ہوا اور ساتھ ہی یہ بھی محسوس ہوا کہ ان کو اپنے مشن کی سچائی کا پورا یقین ہے، اور جس مشکل کام کا انہوں نے ارادہ کیا ہے ان میں کافی عزم وحزم موجود ہے۔‘‘

مولانا مودودی اور مدرسۃ الاصلاح

میں اس وقت مدرسۃ الاصلاح میں داخل ہو چکا تھا مگر یہ میری زندگی کا بالکل ابتدائی زمانہ تھا، کم عمری کی وجہ سے مجھے کچھ یاد نہیں۔ میں نے سید مودودی کو دیکھا بھی نہیں ہوگا، بہرحال مدرسۃ الاصلاح کے اس سفر اور مدرسہ کے اساتذہ اور طلبہ سے ملاقات کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ مدرسہ سید مودودی کی دعوت وتحریک کا ایک اہم مرکز بن گیا۔ افراد کو چھوڑ کر اگر کسی ادارے نے سید مودودی کی دعوت پر لبیک کہا اور ان کا ساتھ دیا تو وہ مولانا فراہی کا قائم کیا ہوا مدرسۃ الاصلاح تھا۔ مولانا فراہی کے لگائے ہوئے باغ میں انہیں بکثرت اپنے ذوق اور مطلب کے پھول پھل ملے۔ مولانا فراہی کے تلمیذ خاص امین احسن اصلاحی مدرسہ چھوڑ کر ان کی دعوت پر پٹھان کوٹ آ گئے۔ اختر احسن اصلاحی، ابواللیث اصلاحی، صدرالدین اصلاحی اور ان کے بے شمار تلامذہ نے جماعت میں شامل ہو کر اس کے علمی اور فکری محاذ کو ہی نہیں سنبھالا بلکہ جماعت کو اعلیٰ قیادت بھی فراہم کی۔ مولانا امین احسن اصلاحی جب تک جماعت میں رہے ان کا مقام جماعت کے تنظیمی ڈھانچے میں بہت نمایاں رہا۔ مولانا اختر احسن اصلاحی مرحوم اخیر دم تک جماعت کے رکن اور شوریٰ کے ممبر رہے۔ ابواللیث اصلاحی ہندوستان کی جماعت کے آج بھی امیر ہیں۔ صدرالدین اصلاحی جماعت اسلامی ہند کی ریسرچ اکیڈمی علی گڑھ کے ڈائرکٹر اور دیگر گراں بار ذمہ داریوں کے حامل ہیں۔ ان اکابر کے علاوہ اصلاحی برادری کے بے شمار اصاغر سید مودودی کی قائم کی ہوئی اس تحریک کو آگے بڑھانے کے لیے سرگرم عمل ہیں۔ اصلاحیوں ہی کی ایک ٹیم

ہے جو جامعۃ الفلاح کے نام سے اعظم گڑھ میں جماعت اسلامی کا ایک تعلیمی ادارہ نہایت کامیابی کے ساتھ چلا رہی ہے اس ادارے میں مختلف سطح کے پندرہ سو طالب علم اقامتی درس گاہ کی برکتوں سے فیض یاب ہو رہے ہیں۔ جو اصلاحی عملاً جماعت اسلامی میں شریک نہیں یا جو جماعت اسلامی سے اختلاف بھی رکھتے ہیں وہ بھی سید مودودی یا جماعت کے دشمن نہیں ہیں۔ رہا تنقید و اصلاح کا عمل تو یہ ایک ''اصلاحی'' کا طرۂ امتیاز ہے۔ یہ فیض ہے فکر فراہی کا اور اس نظام تعلیم کا جو مولانا فراہی نے مدرسۃ الاصلاح میں رائج کیا۔

آخری سوال

اب میں چند جملے اس پہلو پر کہہ کر بات ختم کروں گا کہ فکر فراہی جس کا محور قرآن ہے اور جس میں ان کے کچھ مختصات و تفردات ہیں، آیا اس کا کوئی پرتو، عکس یا جھلک ہمیں سید مودودی کے فکر و فن میں بھی سلباً یا ایجاباً نظر آتا ہے یا نہیں۔ اس اعتراف کے باوجود کہ میں نے اس نقطۂ نظر سے ابھی ان دونوں کا باقاعدہ تقابلی مطالعہ نہیں کیا ہے، پھر بھی اب تک کی معلومات اور مطالعہ کی بنیاد پر میں یہ کہنے کی ذمہ داری قبول کرتا ہو کہ دو چیزوں میں موازنہ و مقابلہ کی جو عام بنیادی شرائط ہیں وہ یہاں نہیں پائی جاتیں۔ اس لیے اس طرح کی کوئی کوشش شاید سود مند ثابت نہ ہو۔ سید مودودی کی تصانیف میں تفہیم القرآن ہی ایک ایسی کتاب ہے جس میں مولانا فراہی کے علمی یا فکری اثرات کو تلاش کیا جا سکتا تھا۔ لیکن یہ اس لیے خارج از امکان ہے کہ تفہیم کا مقصد و منہاج اور ہے جسے نظام القرآن کے مقصد و منہاج سے کوئی تعلق نہیں۔ تفہیم ایک تبلیغی تفسیر ہے جو عامۃ الناس کے لیے لکھی گئی ہے جب کہ مولانا فراہی کے علوم و افکار کے مخاطب بہ معنی عام علماء بھی نہیں بلکہ خواص اہل علم ہیں۔ سید مودودی نے کتاب کے دیباچہ اور مقدمہ میں تفہیم کی اس خصوصیت کو وضاحت سے لکھ دیا:

> ''اس کام میں میرے پیشِ نظر علماء اور محققین کی ضروریات نہیں ہیں، اور نہ ان لوگوں کی ضروریات ہیں جو عربی زبان اور علوم دینیہ کی تحصیل سے فارغ ہونے کے بعد قرآن مجید کا گہرا تحقیقی مطالعہ کرنا چاہتے ہیں۔ ایسے حضرات کی پیاس بجھانے کے لیے بہت کچھ سامان پہلے سے موجود ہے۔ میں جن لوگوں کی خدمت کرنا چاہتا ہوں وہ

اوسط درجے کے تعلیم یافتہ لوگ ہیں جو عربی سے اچھی طرح واقف نہیں ہیں۔ اور علوم قرآن کے وسیع ذخیرے سے استفادہ کرنا جن کے لیے ممکن نہیں ہے۔ انہی کی ضروریات کو میں نے پیش نظر رکھا ہے، اس وجہ سے بہت سے ایسے تفسیری مباحث کو میں نے سرے سے ہاتھ ہی نہیں لگایا جو علم تفسیر میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں مگر اس طبقے کے لیے غیر ضروری ہیں۔ پھر جو مقصد میں نے اس کام میں اپنے سامنے رکھا ہے وہ یہ ہے کہ ایک عام ناظر اس کتاب کو پڑھتے ہوئے قرآن کا مفہوم و مدعا بالکل صاف صاف سمجھتا چلا جاتا ہے، اور اس سے وہی اثر قبول کرے جو قرآن اس پر ڈالنا چاہتا ہے۔ اس طرح پڑھنے سے مجھے توقع ہے کہ ایک عام ناظر کو قرآن مجید کی عالمانہ واقفیت نہ سہی، عامیانہ واقفیت انشاءاللہ بخوبی حاصل ہو جائے گی۔"

(تفہیم القرآن ج ۱، ص ۵-۱۲)

سید مودودی نے بغیر کسی ذہنی تحفظ کے انتہائی غیر مبہم الفاظ میں اس بات کی تصریح کر دی ہے کہ تفہیم میں ان کے مخاطب محققین اور علماء نہیں بلکہ اوسط درجے کے تعلیم یافتہ لوگ ہیں اور ان کا مقصد فی الجملہ ان کو مطالب قرآن کی عمومی واقفیت بہم پہنچانا ہے اور بس۔

مولانا فراہی کی تفسیر نظام القرآن کے مخاطب وہ علماء و محققین ہیں جن کی رعایت سید مودودی نے تفہیم القرآن لکھتے وقت اس لیے ملحوظ نہیں رکھی کہ ان کی سطح کا تفسیری لٹریچر پہلے ہی کافی لکھا جا چکا ہے۔

اتنی بحث کے بعد بھی یہ نکتہ غور طلب رہتا ہے کہ سید مودودی کو مولانا فراہی کے تلامذہ میں شمار کیا جائے یا نہیں۔ مجھے کسی ایسی دستاویز کی تلاش ہے جس میں سید مودودی نے خود مولانا فراہی کے لیے استاذ کا لفظ استعمال کیا ہو۔ ایسی ایک شہادت کا سراغ ملا تو ہے لیکن ہنوز وہ نظر سے گزری نہیں۔ ذکریٰ رام پور کے احیائے اسلام نمبر ۲ میں سید مودودی نے ایک استفسار کے جواب میں جہاں اپنے اساتذہ کا ذکر کیا ہے مولانا فراہی کا بھی ذکر استاد کی حیثیت سے کیا ہے۔
